۷۸۶   ھوالکل   یامعین

غدر دہلی کے افسانوں کا

گیارھواں حصہ

دہلی کی آخری شمع

از جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے

مصنف کی اجازت سے شائع کیا

اور

ابن عربی کارکن حلقہ مشائخ دہلی نے بماہ مئی سنہ ۱۹۲۸ء

پہلی بار ریاست برقی پریس دہلی میں چھپوایا

طبع اول   قیمت عہ

غدرِ دہلی

غدرِ دہلی کے افسانوں کا پہلا حصّہ

بیگمات کے آنسو

یہ وہ مشہور کتاب ہے جس کو خواجہ صاحب کی تصنیفات میں ماسٹر پیس یا اعلیٰ درجہ کی تصنیف کہا جاتا ہے ایک سو بہتر صفحہ کی کتاب ہے۔ لکھائی صاف ہے۔ کاغذ اور چھپائی اعلیٰ درجہ کی۔ ٹائیٹل یعنی سرورق نہایت خوبصورت اور رنگین ہے لیتھو کی رنگ میں چھاپا گیا ہے ۹ دفعہ چھپ چکی ہے۔ تازہ ایڈیشن میں نئے افسانے بڑھائے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ/ر) ۰

غدرِ دہلی کے افسانوں کا دوسرا حصّہ

انگریزوں کی بپتا

جس میں انگریز مردوں۔ عورتوں اور بچوں کی ان مصیبتوں کا حال ہے جو ان کو غدر ۱۸۵۷ء میں پیش آئیں۔ ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ لکھائی۔ چھپائی نہایت اعلیٰ۔ کاغذ بہت دبیز اور عمدہ۔ تین دفعہ چھپی ہے۔ اس میں ۱۳ افسانے ہیں۔ یعنی تیرہ انگریز مرد اور عورتوں نے اپنی کیفیت خود لکھی ہے بہت دردناک اور مؤثر ہے از حضرت خواجہ صاحب۔ قیمت آٹھ آنہ (۸/ر) ۰

غدرِ دہلی کے افسانوں کا تیسرا حصّہ

محاصرۂ دہلی کے خطوط

اس میں ان خطوط کا ترجمہ شائع ہوا ہے جو انگریزی فوج کے افسروں نے دہلی کے محاصرہ کے وقت پنجاب کے انگریز افسروں کو بھیجے تھے۔ ان خطوط میں بعض نہایت دلچسپ اور مخفی تاریخی مراسلات بھی ہیں۔ ضخامت ۳۲ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب اچھا۔ کل تیرہ مراسلے اس کے اندر ہیں۔ از حضرت خواجہ صاحب قیمت چار آنے (۴/ر) ۰

غدرِ دہلی کے افسانوں کا چوتھا حصّہ

بہادر شاہ کا مقدمہ

یہ دو سو اسی صفحہ کی کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ یہ غدرِ دہلی کے حالات میں نہایت دردناک کتاب ہے۔ اس میں اس مشہور مقدمہ کا حال ہے

۷۸۶ ھوالکل یامعین

غدر دہلی کے افسانوں کا
گیارھواں حصّہ
دہلی کی آخری شمع

حسن نظامی کا دیباچہ

سدا رہے نام اللہ کا۔ دنیا کے طلسم خانہ میں کون رہا ہے جو دلی کی شان رہ جاتی۔ اور کون جانتا ہے کہ دلی اُجڑنے کے بعد لندن کی آبادی نمودار ہوئی تو یہ آبادی کب تک قائم رہیگی۔ اور کونسا انگریز حسن نظامی کی طرح ٹیمز دریا کے کنارہ بیٹھ کر لندن کی ختم شدہ شان کے افسانے لکھا کرے گا۔

میں نے دہلی کی بربادیاں دیکھیں۔ آبادیاں دیکھنے کا وقت نہ ملا کہ میری پیدائش سے برسوں پہلے ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے ماں باپ نے اور نانا نانی نے بادشاہ اور ان کے خاندان کو اپنے گھر میں آتے جاتے دیکھا اور قلعہ میں مہمان بنکر مغلوں کی آخری بہار کی سیر کی تھی۔ اور پھر انھوں نے ان سب کا بگڑنا اور بکھرنا اور در بدر خاک بسر ہونا بھی دیکھا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو رات دن یہی غمگین کرنے والی کہانیاں سُنیں۔ اور دل ہلانے والی کہانیوں نے ایسے نقش کیئے کہ آج اکیاون سال

کی عمر میں بھی وہ باتیں کانوں میں گونجا کرتی ہیں۔

لکھنے کا زمانہ آیا تو دل کے اثرات نے سب سے زیادہ دہلی اور غدر ۱۸۵۷ء کے حالات پر متوجہ رکھا۔ پہلا مضمون بہادر شاہ کے خاندان کی نسبت چھپا تو ملک میں دھوم مچ گئی۔ میں سمجھا یہ میدان لکھنے کے لیئے ایسا ہی عمدہ ہے جیسا شاعری کے لیئے تصوّف سب سے اچھا میدان ہے۔

پھر تو ایک کتاب شائع ہوگئی۔ اور لوگوں نے انگریزی سرکار کو اسکے خلاف بدگمان بھی کرنا چاہا مگر سرکار نیت کو دیکھتی تھی کہ میں عبرت کی تاریخ لکھتا ہوں۔ انقلاب کے مقصد سے میرا کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

پھر اس سلسلہ کا دوسرا تیسرا یہاں تک کہ دسواں حصّہ بھی شائع ہوگیا اب میں نے خیال کیا کہ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ اس کے بعد کچھ باقی نہیں ہے جسکو لکھوں۔ ہاں شاہی خاندان کے کسی فرد کا کوئی قصّہ مل جاتا تو اس کو نمک مرچ لگاکر کسی رسالہ میں چھپوا دیتا تھا۔

یکایک جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی رجسٹرار ہائی کورٹ حیدرآباد کا ایک مضمون دہلی کے ایک مشاعرہ کی نسبت نظر آیا جو رسالہ اردو اور رسالہ الناظر اور کتاب مضامین فرحت میں شائع ہوا تھا۔

وہ مضمون میرے دوست ملا واحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ دہلی نے سب سے پہلے دیکھا اور چونکہ ان کا خاندان شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ سے دہلی میں ہے، اور اس کے تعلقات قلعہ سے ہمیشہ رہے تھے اسلیئے ان پر دہلی کے اس مشاعرہ نے بڑا اثر کیا۔ اور میں نے ان کے کہنے سے تمام و کمال مضمون پڑھا۔ حالانکہ میں آجکل کام کی کثرت کے سبب اکثر مضامین کے مطالعہ سے محروم رہتا ہوں۔

جب میں نے اسکو پڑھا توفوراً انگریزی اخبار رینگ مسلم دہلی کے ایڈیٹر صاحب سے کہا کہ اس مضمون کا ترجمہ کیجئے تاکہ یورپ وامریکہ کو بھی دہلی کی آخری شمع کی روشنی نظر آسکے۔

اس کے بعد میں نے میرزا فرحت صاحب کو اپنے عزیز دوست مولوی منظہر اللہ نظامی کے ذریعہ خط لکھا کہ وہ مجھکو یہ مضمون بصورت کتاب شائع کرنے کی اجازت دیں میرزا صاحب نے جواب دیا اور ایسا جواب جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ میری خواہش کے قدر دان ہیں۔ ان کی اجازت حاصل ہوتے ہی میں نے اس مضمون کا نام "دہلی کی آخری شمع" مشاعرہ کی رعایت سے رکھدیا اور چھپوانے کی تیاری ہونے لگی۔

دہلی کے مصوروں کو تلاش کیا کہ ان میں کوئی ایسا نکلے جو میرزا فرحت کے لفظی مرقعوں سے تصویریں بنادے اور میں ان کو کتاب میں درج کردوں۔ مگر اب تک مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

خدا کا نام لیکر کتاب کاتب کو دیتا ہوں۔ تصویریں مل جائینگی یا بن جائینگی تو ان کو بھی شریک کردونگا ورنہ میرزا فرحت نے مصوری میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ صورتیں دکھانے، لباس بتانے، اور بول چال، رنگ ڈھنگ کی نقل اُتارنے میں کمال کردیا ہے، مصور سے یہ بات نہ ہوسکتی جو الفاظ کی تصویروں نے اس مضمون میں پیدا کردی ہے۔

میں چاہتا تھا کہ اس مضمون پر ایسا دیباچہ لکھوں کہ اس کی ہر خوبی پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے مگر ایک مہینہ سے غم والم کے پہاڑ کے نیچے دبا پڑا ہوں۔ ۱۳ جنوری ۱۹۲۸ء کی شام کو مجھپر کسی ظالم نے پستول چلایا اور جی بھر کر نشانہ لیا مگر میں نے میرا چہرہ اور سینہ اسکے سامنے تھا اور وہ نشانہ باندھ کر فیر کررہا تھا مگر کمبخت گولیاں نشانہ بازی کی حریف تھیں، ایک گولی نے بھی قاتل کا ساتھ نہ دیا اور کوئی گولی میرے نہ لگی، البتہ میرے

بوڑھے خسر پیرزادہ سید محمد صادق کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ان کے گولی لگی اور وہ پون گھنٹہ خاک و خون میں لوٹ لوٹ کر ختم ہو گئے۔

آج فروری ۱۹۲۸ء کی ۲۹ تاریخ ہے۔ گویا پورا ایک مہینہ ہو گیا لیکن خواجہ بانو کا غم پہلی گھڑی کی طرح تازہ ہے، ان کے تو وہ باپ تھے۔ اور میرے بچوں کے نانا تھے۔ مگر میرے گھر کا بیان ہے کہ وہ اس کے بھی باپ تھے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ میرے ماموں زاد بھائی بھی تھے، اور میرے بچپن سے آج تک سرپرست بھی تھے اور اب بارہ تیرہ سال سے خسر بھی تھے۔

جنگل میں اکیلا گھر، دشمنوں کی قتل کے بعد بھی رات دن کی دھمکیاں، پولس کے عجیب و غریب حالات، دماغ قابو میں نہیں ہے اور دل تو شہید کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔

ایسی حالت میں کیا دیباچہ لکھوں اور کہاں سے وہ جذبہ لاؤں جو میرزا فرحت کے کمالات کی ترجمانی کر سکے۔

آخری بات یہ ہے کہ چوٹ کھایا ہوا دل خود ہی سمجھ لیگا کہ میرزا فرحت نے دہلی کی اس شمع کی زیارت کرادی ہے جو مسلمانوں کی گذشتہ رات کو محفل کی رونق بڑھا رہی تھی اور مرنے والی قوم کی مٹنے والی تہذیب کو دکھا رہی تھی، اور جس نے صبح کے قریب روتے روتے ہچکیاں لیتے لیتے ایک آہ کی تھی اور ایک آہ کے ساتھ اس کا شعلہ بجھ کر اور دھواں بنکر اڑ گیا تھا۔

میں دہلی شہر کے اندر اس کتاب کو شائع کر رہا ہوں وہی دہلی جسکے مشاعرہ کا اس کتاب میں بیان ہے۔ مگر نہیں یہ تو خواب کا بیان ہے، وہ دہلی اب کہاں؟ جسکی گردش شمع کا یہ افسانہ ہے۔ اب تو نہ کوئی شمع باقی ہے نہ کوئی پروانہ ہے +

حسن نظامی - دہلی - ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(۱)

تمہید

نامِ نیکِ رفتگاں ضایع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم "انسان" ایک "محشرِ خیال" ہے۔ لیکن خیال میں حشر بپا ہونے کے لیے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے بچپن سے شعرائے اُردو کے حالات پڑھنے اور سُننے کا شوق رہا ہے، مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو اُن کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی، اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوش نما چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ پُرانے قدیم کاغذات میں مجھکو حکیم مومن خاں "مومن" دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی، تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگِ خیال" کی محفلِ شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر اُن لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کی بجائے صرف اُن کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں رفتہ

رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں اس عقدے کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے　　بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا دل میں آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے، دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔ قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے۔ اُردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا، بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اُس میں قلعہ کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ برخلاف اسکے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہ رہی تھی۔ پھر بھی "دریائے جمنا کی چمکیلی ریت" دہلی والوں کے لیے نظر فریب رہی اور اُس "اُجڑے دیار" میں شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جسکی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنی دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملینِ فن میں سے بہت سے تو ملکِ عدم کو سدھارے، جو بچے کھچے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا، جسکو جہاں کچھ سہارا ملا، وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رامپور آباد ہوئے۔ اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر اُن کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں، بہت سے اُٹھ گئے، بہت سے اُٹھتے جاتے ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے، کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہیگا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا، جسطرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم کہ اُن کی قبر کہاں ہے۔

ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اُردو" کے لیئے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جسکی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اُردو کے اُن محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دُھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور اُن کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم اُن کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اُس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنّف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اسکی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سُننے سے زیادہ مؤثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جسکے شروع میں اُس کے حالات درج نہ کیئے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنھوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو اُن کاملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں، بہت سے ایسے مرقعے پائینگے جو دوسرے مصوّروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں، بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اُتارے گئے ہیں، اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہونگی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں، لیکن ہر صورت میں شہادت تائیدی کے

مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعے کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اُس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے حلیے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بنکر بے لطف ہو جاتا، لیکن اِدھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگِ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ اُدھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱؁ ہجری کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی اسکی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔ البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ ۱۲۶۱؁ ہجری کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں اور

ہیچو سبزہ بارہا روئیدہ ام ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پہ باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکدوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصّہ لیا تھا جس کے مکان پہ یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اسکو اتنی وسعت دی ہے کہ اُس زمانہ کے تقریبًا سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دیجائے کہ "مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے، جو اُن سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے

ہیں۔" ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفتگانِ خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اُردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجیئے "میں" اب "مولوی کریم الدین صاحب" کی جون میں حاضر خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کیئے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ بُرا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہیئے، مولوی صاحب کو کہیئے اور خوب دل بھر کر کہیئے۔ میں خوش اور میرا خدا خوش۔ والسلام۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

۲۔ تدبیر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے، میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ۲۸ کوس پر بجانبِ شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے، مولویوں کا خاندان تھا، لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے، جائداد ضبط ہو گئی، میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گذار دی۔ جب ضبط شدہ جائداد کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے اُن کا دامن پکڑ لیا، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیئے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اُٹھے۔ میں سنہ ۱۲۳۰ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا

میری تعلیم انہی دو بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی لیکن بے چین طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑایا۔ اُس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے ؎ ملا کی دوڑ مسجد" میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی آ گیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارا کرتا، محنت مزدوری کے بعد بھی ذوق علم ہر حلقۂ درس میں مجھے لے جاتا۔ اسی زمانہ میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی طالب علموں کی تلاش تھی۔ میں بھی ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سولہ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا، اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی، لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لیے حاصل کیا جاتا، اب اس کے ساتھ گزارہ کی ایک بڑی شق لگ گئی تھی۔ اس لیے چند دوستوں کے ساتھ ملکر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے، لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیئے تھا نہ چلا۔ یہ اُردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کر کے شعراء کے حالات اور اُن کا کلام طبع کروں، ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے، بلکہ شعر کہنا میں بُرا جانتا ہوں، کیونکہ اہلِ علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لئے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ

ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی غریب کو مُنہ نہیں لگاتے، دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے۔ وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں، عارف، پر نظر پڑی اُن سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں، لال کنویں کے پاس ایک حویلی ہے اُس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے، گوری رنگت، اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ ڈاڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے، ٹھوڈی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی۔ کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے، بہرحال اُن کی محبت، اُن کی شرافت، اور سب سے زیادہ اُن کے رسوخ نے مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل اُن کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں ہی میں تھا۔ واپسی میں دروازہ پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعہ سے اطلاع کرائی۔ اُنھوں نے اندر بُلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے، صحن میں نہر ہے، سامنے بڑا چبوترہ ہے اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان، مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے، ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے، سامنے گاؤ تکیے سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے تو اُن کو پہچانا بھی نہیں، سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی، کہنے لگے "مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا، علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھانا ہے

ہیں، مگر یہ تو کہیئے آج آپ کدھر نکل آئے۔" میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی، تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ایک آہ بھر کر کہا۔" میاں کریم الدین! تم کو بات تو اچھی سوجھی ہے، مگر بھئی اس کا نباہنا مشکل ہے۔ تمہیں خبر نہیں دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیے ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو، میں بھی کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے ہاں ٹھہرو، حکیم صاحب کو آنے دو، ایک تجویز ذہن میں آئی ہے، اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنا پوری ہو جائیگی اور تمھارا بھی کام نکل جائیگا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں، سفید بھری ہوئی ڈاڑھی، گول چہرہ، اُس میں کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے، فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں۔ میں آداب بجا لایا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور نواب صاحب سے کہا، آپ کی تعریف کیجیے۔" اُنھوں نے کہا " یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں، خود شاعر نہیں مگر شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں اُن کے حلیئے اور اُن کے کلام کے نمونے دکھائیں۔ مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پُرانے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔" حکیم صاحب کہنے لگے " میاں عارف خدا کے لیئے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ابھی جوان ہو، انشاء اللہ خود طبیعت مرض پر غالب آ جائیگی، اور تمھیں مرض ہی کیا ہے، وہم

ہی وہم ہے، مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟" نواب صاحب نے کہا" حکیم جی اور کچھ نہیں اتنا کردو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچادو، میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی، میں اُن کو سب کچھ سمجھا دونگا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہوگئے تو مشاعرے کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں اور اگر بدقسمتی سے انکار ہوگیا تو پھر مشاعرے کا خیال کرنا ہی فضول ہے، اب رہا مشاعرے کا انتظام وہ میں خود کرلونگا۔ کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں"۔ حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے۔ پھر کہا" عارف! تمھارے لیئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، اس لیئے اور بھی کرونگا کہ اس سے تمھاری طبیعت بہل جائیگی اور کچھ دنوں اس مشغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمھارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے۔ بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں، ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر[1] سے ملا دیتا ہوں۔ اُن کو آجکل مشاعرہ کی لو لگی ہوئی ہے۔ حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کرچکے ہیں مگر وہ ٹال گئے اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سُن کر ضرور اجازت حاصل کرلیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعۂ معلی میں آجائیے۔ میں چوبدار سے کہے جاتا ہوں، یہ اندر پہنچا دیگا۔ آگے آپ جانیں اور آپکی قسمت" یہ کہکر حکیم صاحب نے خدابخش کو آواز دی، وہ آیا تو اُس سے کہا کہ" کل یہ صاحب حویلی[2] میں

---

[1] ان کا نام مرزا فخر الدین، خطاب مرزا فتح الملک، شاہ بہادر، عرف مرزا فخرو اور تخلص رمزؔ تھا بہادر شاہ ثانی کے سنجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولیعہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے۔

[2] قلعۂ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی کو بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن احسان کا شعر ہے کہ

مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں بہادر شاہ غازی کی دوہائی ہو دوہائی ہو

ایک بجے آئینگے، ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا۔" یہ کہکر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ قلعہ معلّٰی پہنچا۔ لاہوری دروازہ کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانے میں "نشست" کہا جاتا تھا، دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، مجھے دیکھ کر بولے۔ اجی مولوی صاحب! میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا: وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے۔ فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لیئے لیتا ہوں، مگر مشاعرے کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ ہم لوگ بھی آ سکیں، خیر بیٹھیئے شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا،" وہ کریم الدین کون صاحب ہیں اُن کو حضور والا یاد فرماتے ہیں،" یہ سُننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا، یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہو گی، اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہو گا۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا۔ آنکھ اُٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندۂ خدا کدھر لیئے جا رہا ہے اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا، اب جو موقعہ ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آندھ آ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جا کھڑا کر دیا اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اُس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں

نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی؟ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالی شان عمارت ہے اس کے دُو درجے ہیں، ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصّہ موتی مسجد کی جانب ہے، وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں، اُن میں فوّارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کیے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں، مگر اوّل تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا۔ دوسرے راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی اور چوبدار نے آکر کہا کہ "چلیے" اس ایک لفظ نے خود بخود پانوں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح اُلٹے سیدھے پانوں ڈالتا، حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے" نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجالاؤ۔" میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا، دُہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا، حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے، پائینتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی، لمبی گردن چوکا ذرا اونچا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت، سر مُنڈا ہوا،

چھدری سی ڈاڑھی، کلوں پر بہت کم، ٹھوڑی پہ ذرا زیادہ، لبیں کتری ہوئی۔ (۷۰) برس سے اونچی عمر تھی، بال سفید بھک ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ڈاڑھی میں اکّا دُکّا سیاہ بال تھا۔ چہرے پر جھُریاں تھیں، لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کراراپن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک بر کا پیجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کُرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کار چوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین مین باپ کی تصویر تھے۔ ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی، فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بڈھے تھے، یہ جوان۔ اُن کا رنگ بُڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلولس لے آیا تھا، ان کا کھُلا گیہواں رنگ تھا۔ اُن کی واڑھی سفید تھی، ان کی سیاہ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ "اماں[1] تمھارا ہی نام کریم الدین ہے! تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو؟" میں نے کہا کہ "خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے حضرت ظلّ اللہ کے سایۂ عاطفت میں آرہا ہے۔" فرمایا "اماں! ابھی تمھارا ہی

[1] قلعۂ دہلی کے دورِ آخر میں شاہانِ دہلی بعض وقت مرد عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اس پُرانے طرزِ کلام کی جھلک حیدرآباد کی روزمرہ میں بھی کسی قدر نظر آتی ہے، مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورّخ نے اس طریقۂ مخاطبت کی بناء پر قلعۂ معلّٰی کی تہذیب اخلاق پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں"، کہتا تھا" معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے ورنہ انکو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں اُنکے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "ماں" ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "ابا" کبھی "دادا" پکارتی ہے۔ (میرے خیال میں یہ "ارے میاں" کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہہ جاتے ہیں۔ اڈیٹر رسالہ اُردو)

تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ
کروں، مگر کیا کروں۔ زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب نہیں معلوم نہیں ہوتا
یہ صحیح ہے کہ "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن"۔ لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی
کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا
تھا؛ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لیئے
بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے
مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا، وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف
میں "تیلیاں" ہی تھیں، کہیں خدانخواستہ اگر ردیف "لکڑیاں" ہوتیں تو
خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی
ٹکر کیسے سنبھالو گے۔ استاد ذوق تو بیچارے بے زبان آدمی ہیں، مگر خدا بچائے
حافظ ویران سے وہ ضرور لڑ مرینگے۔ اور تم جانتے ہو" اندھے کی داد نہ فریاد
اندھا مار بیٹھے گا" کی صورت ہے۔ کسی نے اگر مشاعرے میں استاد پر ذرا بھی چوٹ
کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا
نظر نہیں آتا۔" میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے
بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین
خاں عارف نے اپنے ذمے لیا ہے۔" فرمایا "تو پھر مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا
بڑا ہشیار اور ذہین ہے، مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا،
رہے استاد ذوق ان سے میں کہدونگا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ
چل جائیگا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو
کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبو تو آ نہیں سکتے ہیں
ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیجدونگا اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجونگا۔ ہاں

یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے؟ "طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی۔" اے ہے یہ انا بچہ کو کیا بے طرح سلا گئی ہے۔" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرے میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر، جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔" میں نے عرض کی پیر و مرشد تاریخ؟ "فرمایا" ۱۴ر رجب مقرر کردو۔ دن بھی اچھا ہے، چاندنی رات بھی ہوگی، آج پانچ تاریخ ہے نو دن باقی ہیں؛ اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہوسکتا ہے۔ انگریزی کی ۲۰ر جولائی پڑیگی موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔" میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی اور خوش خوش الٹے قدموں واپس ہوا۔ مرزا فخرو بیچ میں نہیں بولے۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انھیں کا ہے، ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوت شاہی۔ سچ ہے" بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے"۔ یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لیے حضوری اتنی مشکل نہ تھی جتنا رخصت ہو کر یہ الٹے پاؤں چلنا ہوا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگی تھی، اسلیئے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے ایک دیوار سے ٹکرایا اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا۔ خیر بہزار مشکل اس جادۂ ادب کو طے کرکے باہر نکل ہی آیا۔ ادھر میں نکلا، اُدھر چوبدار ساتھ ہوا۔ اس کو انعام دے دلا کر ٹالا، حکیم صاحب کے پاس آیا، وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ اُن سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے۔ "مولوی صاحب! بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لیئے بے چین ہو رہے تھے، انھیں کی یہ کارگزاری ہے، ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہوتا، مگر چلو تمھارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے بھی جاکر کہدو

وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کیے۔ کہنے لگے کہ "چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی۔ اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو۔ مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں، اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ کیا عجب ہے کہ میرا نام سن کر راضی ہو جائیں دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کر دو، مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا" میں نے عرض کی "اور میں کہاں جاؤں؟" فرمانے لگے "میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لیے آجاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو انھیں کے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے" میں نے کہا "مشاعرے میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سوا سو روپئے اٹھ جائینگے" یہ سنکر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین۔ تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے ہزار دو ہزار میں بھی اگر یہ تہ پورا ہو گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے" یہ سنکر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے کہا "نواب صاحب! اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے، مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے" فرمانے لگے "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو خدا یہ مشکل بھی آسان کر دیگا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں

اور میرا کام جانے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو، ذرا آرام لے لو۔ اور کل صبح ہی سے اِدھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو، اُدھر ان تینوں اُستادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے، آخر میرے ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔" وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی صبح اٹھکر اپنے پہننے اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ پہلے اُستاد ذوق ہی سے بسم اللہ کروں۔

کابلی دروازہ کے پاس ہی اِن کا مکان ہے، مکان بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے، اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیئے مشکل سے جگہ رہتی ہے سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اسکے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو اُستاد صحن میں بان کی کھرّی چارپائی پر بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے۔

دوسری چارپائی پر اُن کے چاہتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے یہ اندھے ہیں اور انھی سے ہوشیار رہنے کے لیئے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اُستادِ ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں، رنگ اچھا سانولا ہے، چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں، چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پیجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر ململ کی ٹوپی

گول چبندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پانوں کی آہٹ سُنتے ہی
حافظ ویرآن نے چونک کر کہا "کون ہے" میں نے کہا "کریم الدین، اُستاد
ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔" اُستاد نے اپنا نام سُنکر کہا۔
"آیئے آیئے، اندر تشریف لایئے۔" میں نے آداب کیا۔ اُنھوں نے فرمایا
"بیٹھو، بھئی بیٹھو۔" میں حافظ ویرآن کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا
"فرمایئے کیسے تشریف لانا ہوا؟" میں نے عرض کی کہ "میرا ارادہ قاضی کے
حوض پہ ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے
اگر حضور بھی ازراہِ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔" میرا
اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویرآن تو چراغ پا ہوگئے۔ کہنے لگے "جایئے جایئے، کہاں کا
مشاعرہ نکالا ہے؟ اُستاد کو فرصت نہیں ہے۔ اُن مرزا لے پالک[۱] کے
پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔" اُستاد نے کہا
"بھئی حافظ ویرآن! تمھاری زبان نہیں رُکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے
لڑائی مول لیتے ہو۔" حافظ ویرآن کہنے لگے "اُستاد، جب وہ آپ کو بُرا
بھلا کہیں تو ہم کیوں چُپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہینگے تو ہم سو سنائینگے۔ اور تو
اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں، کل ہی کی بات ہے آپ کو ناوڑا کہہ رہے تھے
مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کرینگے اُن کی سات پشت کو تو م ڈالا۔"
اُستاد ہنسکر فرمانے لگے "نا بھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو

[۱] ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اُڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے انکو پال لیا ہے اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں حافظ ویران نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اُسکے حسب نسب میں انھوں نے کیڑے ڈالے۔ اُستاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے انکے ہاتھ میں اُسترے کی بجائے تلوار دیکر ان کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

مجھے جسکا جو جی چاہے سو کہے۔ میں نے تو ان سب کا جواب ایک باعی میں دیدیا ہے

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق　　ہے برا وہ ہی کہ جو تجھکو برا جانتا ہے
اور جو خود تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے　　کیوں برا کہنے سے اسکے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ "میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیجکر مشاعرہ کی عزت بڑھائیں گے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوق بھی کہدینگے وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئینگے"۔ یہ سنکر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ استاد نے فرمایا "ہاں بھئی مجھے یاد آگیا۔ کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے؟" میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ "حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکال دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے آکر غزل پڑھے"۔ استاد تو "بہت خوب بہت خوب" کہتے رہے۔ مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ "اللہ خیر کرے، دیکھیئے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے اشتقلے[۱] چھوڑا کرتے ہیں" وہ اپنی کہے گئے ہیں تو اٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا، چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے قاسم جان کی گلی کٹی ہے بائیں طرف پہلا ہی مکان اُن کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے، اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان

[۱] معلوم نہیں یہ کس زبان کا لفظ ہے مگر دہلی میں عام طور پر "شگوفے" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیئے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رو آدمی ہیں، قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا، موٹا موٹا نقشہ اور سرخ سفید رنگ ہے۔ لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا، اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے، ایک برکا سفید پجامہ، سفید ململ کا انگرکھا اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا چغہ[۱]۔ میری آہٹ پا کر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا، سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آ گئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں "رخشاں"، اور فارسی میں "نیر" تخلص کرتے ہیں، کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ انشا پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم انساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، چگی ڈاڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں، ایک برکا سفید پجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی

[۱] قلعہ دہلی کے عجائب خانے میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے، اس سے یہ لباس کیا گیا ہے۔

ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُنھوں نے بڑھ کر مُصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے، پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے "ہیں میاں نیر" تم کس وقت آ بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔" میری طرف دیکھ کر کہا "آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں" فرمانے لگے "حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا، کل ہی میاں عارف آ کر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیر! تم بھی چلو گے؟" نواب صاحب نے کہا "جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لیجائینگے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہونگا۔" مرزا صاحب نے پوچھا "مگر بھئی اب تک "علائی" نہیں آئے۔ مجھکو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو! وہ آ ہی گئی بھئی بڑی عمر ہے، ابھی میں تم ہی کو پوچھ رہا تھا۔"

نواب علاء الدین خاں علائی، نواب لوہارو کے ولیعہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ لباس میں خلطے کا تنگ مہری کا پیجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا، اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ ہی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی، وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور کہا "واقعی آج دیر ہو گئی، مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہونگے۔" میری طرف دیکھ کر کہا "آپ کی تعریف؟" مرزا نوشہ نے تمام قصہ

بیان کیا اور کہا "علائی! تم کو بھی چلنا ہوگا۔ ابھی تو شاید لوہارو نہیں جا رہے ہو" اُنھوں نے کہا "بہت خوب آپ تشریف لے جائینگے تو میں بھی حاضر ہوں"۔ جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ اُنھوں نے مردانے کا ایک حصّہ میرے لیئے خالی کر دیا تھا، جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اُسکو جما جمایا پایا، کپڑے اُتارے اندر سے کھانا آیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے اُستاد رہے ہیں، کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے، مُنہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹھے ہیں، بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک برکا سفید پیجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جُبّہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچہ ہی میں رہتے ہیں، مجھ سے پوچھنے لگے۔ "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا "حکیم مومن خاں کے پاس"، پوچھا "کیا کام ہے؟" میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں" حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان، پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے، لیکن مُنڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے[۱]۔ دالانوں

[۱] میں نے خود یہ مکان، ۲۰، ۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا، ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا، تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی، سامنے کا حصّہ قائم تھا۔ معلوم نہیں کہ اوپر کی مُنڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی مُنڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے۔ ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے اُن کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی "دست و بازو بشکست"

میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے۔ قالین پر گاؤ تکیے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ 'رقم' اور مرزا رحیم الدین 'حیا' مؤدب دوزانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت تھے، سرخ و سفید رنگ تھا جسمیں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنوئیں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اُن پر پان کا لاکھا جما ہوا مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی موچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی اُنگلیاں، سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال زلفیں بنکر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں، کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑکر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا، لیکن اُس کے نیچے کُرتہ نہ تھا، اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اسمیں چھوٹا سا سُنہری تعویذ، کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اسکے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پیجامہ، مہریوں پر سے تنگ اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک برکا پیجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی اُلٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دوپلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ

نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولوی صہبائی دونوں پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین حیا' سے کہہ رہے تھے کہ "صاحب عالم! تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کردیا ہے۔ ایک ہوں، دو ہوں، آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے" صاحب عالم نے کہا "استاد کیا کروں۔ رزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں، کچھ تو میں خود حل کرکے اُن کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں" حکیم صاحب نے نظر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لیکر کہا "بیٹھیے بیٹھیے" ہم بیٹھ گئے۔ اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے "میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہوگی میں کہتا ہوں نہیں، سبز کو ہوگی، تم بساط بچھاؤ۔ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کرلوں۔ اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو، میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی، اسکا جوڑا آئے پر آئے"۔ سکھانند حکیم تھے، رقم تخلص کرتے تھے، دھرم پورے میں رہتے تھے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی، ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے، بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ اُستاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے، حکیم صاحب کی باتیں سُنکر "بہت خوب، بہت مناسب" کہتے رہے اُن سے گفتگو کرکے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے۔ اور آپ کے ثنا یہ صاحب

کون ہیں ؟" مولوی صہبائی نے کہا " یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں"۔ حکیم صاحب نے ہنسکر کہا "بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں[1]۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ! کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را — تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہُد ہُد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ اُستادوں پر حملہ کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر یہ کہ

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں — ناخنِ قوسِ قزح، شبہ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گزرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا اُن کے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب[2] تو اُن کی بات دوسری ہے وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے، بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ " اس مشاعرے میں اُستاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئیگی"۔ فرمایا، ہر شخص مختار ہے، چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے، میں تو نہ آؤنگا نہ غزل بھیجونگا"۔ یہ باتیں

---

[1] یہ اُستاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

[2] ان کا مفصل حال آگے آئیگا۔ یہ بھی عجیب بے تم تھے۔

ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گھٹے لیکر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے اِن کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آکر ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اُتاری اُس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اُس سے آملی۔ اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے[1] ہم لوگ بیٹھے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا "کہو میاں رقم، تم نے دیکھا"۔ اُنھوں نے کہا "جی ہاں، ایک خانے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُس کی معافی چاہتا ہوں"۔ کہنے لگے، اسکا خیال نہ کرو، انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو میاں صہبائی، مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے"۔ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا "مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے، وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اُن کو اب زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ اُن کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے اُن کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے"۔ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب

---

[1] یہ واقعہ ہے۔ اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے۔ میں نے یہ واقعہ خود اُن کی زبانی سُنا ہے۔

بڑے غور سے میری بات سُنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے" افسوس ہے، کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔" میری طرف دیکھ کر کہا "اچھا بھئی، تم جاؤ، میری طرف سے عارف سے کہدینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا " نواب صاحب نے " نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی" حکیم صاحب کہنے لگے" میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے راستہ میں اُن سے بھی کہتے جاؤ۔ کہدینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے؟ مشاعرہ کہاں ہوگا؟ اور 'طرح' کیا ہے؟" میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔ "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے" ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں، جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کی جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو۔ نہ شعر کہنے میں جی لگتا اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" یہ کہکر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا، اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے، دونوں سے ایک

ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ یہ سوچ کر اندر گیا، مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے، انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے، صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اسمیں مختصر سی نہر ہے، سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے، اُن پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۶۵، ۷۰ سال کی تھی، گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، بھری ہوئی ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں، ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں، بدن میں سفید ایک بر کا پیجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ تھا[۱] جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا، اُن کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اُس پر نیچی سیاہ گول داڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا، لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا تنگ مہری کا سفید پیجامہ، سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما پچگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

---

[۱] پُرانے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گذرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا، شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گذرتا، خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی۔ ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لیے دیے رہتے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے ہر شخص دوزانو مؤدب بیٹھا ہے بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب پایا جاتا ہے، کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دئے، کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دو زانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا "ہیں! خانصاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے۔ بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔" میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "ہاں یوں کہو، یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ سُنکر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہدینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے۔" یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا جب حال بیان کیا تو اُن کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں ان پر تو آپ کی بیماری سُننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اُن کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا، صرف آپ کی وجہ سے اُنھوں نے یہ عہد توڑا ہے۔" نواب صاحب نے کہا "میاں تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم؟ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ خیر اسکو جانے دو! اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں۔" فرمایا "نہیں بھئی، نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے ملکر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو، بلکہ تم تو ادھر آنا بھی نہیں، تم نے آکر اگر مین میخ نکالی تو مجھ پر دُہری تہری محنت پڑ جائے گی۔"

۳۔ ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابوالفدار کے ترجمہ میں ایسا گتھ گیا کہ ۸، ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر گھر میں اُن کی صورت دکھائی دیتی۔ اس لیے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھا۔ بہر حال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گذر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ پہلے رجب کو شام کو ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں، کوئی کہتا کہ اس سے کیا کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پہ آیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور اُن میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزارِ آتشیں کر دیا ہے صدر دروازہ سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

چاروں طرف دیکھتا اور کہتا "واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ! واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا۔" چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار پڑے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے، تختوں پر دری، چاندنی کا فرش، اُس پر قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوارگیریوں، قمقموں، چینی، قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شئے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگاجمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اسکے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز[1] کارچوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز، چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر منقیش کے گپھے تھے، اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے، اس سرے سے اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے، کھنچی ہوئی تھی، چھت گیری کے بیچوں

[1] سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا، کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں، دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے، باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جابجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے، تمام مکان مشک عنبر اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا، قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی، حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان پر سے اُٹھ آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر اُن پر خاصدان رکھ دیے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک نہ پھولوں کی آگئی تھی، خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اُن میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بُن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول، شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا۔ غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشہ تھا، میں تو الف لیلہ کا ابوالحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی[1]۔ میں اس تماشہ میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین، رسا، آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں، استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، بہت رحم دل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دخل فصل

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال سنا ہی بجنسہٖ اسی پر اس مشاعرہ کا نقشہ قائم کیا ہے

نام کو نہیں ہے۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں "چڑھے سب سے پہلے اور اُترے سب سے پیچھے"۔ اُنھوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے۔ مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک کر کے سب نہ چلے جاتے یہ اُٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا، لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند۔ جب تک سب نہ چلے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما، تو یہ بھی اُٹھے مگر ایسا اندھیر گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا، کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اس کا جوتا کیا تھا لیترڑے تھے، وہی گھسیٹتے ہوئے چلے؛ اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا۔ "میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا، جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو۔" آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا، دوسرے ہر تیسرے چوتھے اُن سے ایک دو روپئے مار لاتا، مگر اُنھوں نے کبھی "نا" نہیں کی؛ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش اُن کو لیا اور پوچھا۔ ہیں صاحب عالم! میاں حیا، آپ کے ساتھ نہیں آئے" مرزا رحیم الدین حیا، ان کے بڑے بیٹے ہیں؛ لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی

نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے "نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے، جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا اور تخت[1] کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہونگے، اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ اُستاد مانناد رکنار مجھکو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں ہاں بھئی کیوں نہو، تیرھویں صدی ہے، ان کو بنارس بھیجکر میں تو مصیبت میں آگیا۔ ایک نقصان مایہ، دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹیا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور مول لے لی"۔ یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا، کو لے جا ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی ان سے فارغ نہوے تھے کہ کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسان کو جھرمٹ میں لیے آپہنچا بھلا دلی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو، جگت اُستاد ہیں پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا مگر اُستاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑ چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے، اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی، کمر دُہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانے کے یلعم باعور تھے، لیکن

[1] آئے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں؛ اسلیئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی، تاج، کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی اُستادی کا سکہ ایک زمانہ سے تمام دلّی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے اُستاد ہوئے، رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہٗ تک رسائی ہوگئی، وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے، اس لیے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی تڑاخ سے دیتے تھے کہ معترض مُنہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

انھوں نے فوراً عرض کی:۔

نامناسب ہے میاں وقتِ سحرگاہ نہیں

کسی نے "وقتِ سحرگاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انھوں نے جھٹ صائبؔ کا یہ شعر پڑھا

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقتِ سحرگاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔

بڑے دُبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا، شاہ نصیرؔ نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اُڑایا ہے۔

اے خالِ رُخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے اُن سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لا کر بٹھایا، ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی، تشنہؔ چُم ننگے نشے میں چُور، جھومتے جھامتے اندر آئے، نوجوان آدمی ہیں مگر عجیب حال ہے، کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں، کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں

کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں، کبھی اُستاد ذوق کے پاس اصلاح کے لیئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر سُنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سُنی اور یاد کر لی، مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بچارا مُنھ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا "منشی جی یہ کیا رنگ ہے؟" کہنے لگے "اصلی رنگ، مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے؟" نواب صاحب نے کہا "ابھی شروع ہوتا ہے، آپ بیٹھیئے تو سہی، خیر ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے اُن پر ایک دوشالہ لاکر ڈالدیا، اُنھوں نے اُٹھاکر پھینکدیا۔ غرض جسطرح ننگے آئے تھے، اُسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اسکے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا، جو آتا، اُس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لا کر بٹھاتے، حکیم مومن خاں آئے، اُن کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اوّل ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابندِ شرع ہیں۔ اس لیئے خود شعر نہیں کہتے، مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ اُن کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اُس کو دوام کی سند دیدینا ہے، کوئی ۵۰ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانوتے کے ہیں، مگر مدتوں سے دہلی میں آرہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے، مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے، تھوڑے ہی دن ہوئے بچارے پابندیِ شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکّر میں آگئے

تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسے کے معائنہ کو آئے، اُن کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے، انھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جاکر صاحب سے یہ بات لگا دی، اُن کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملاکر اُن کی عزت افزائی کی اُنھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا[1]۔

مولوی صاحب میرے بھی اُستاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا، آداب کیا فرمانے لگے "میاں کریم الدین! میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو بھی مات کر دیا، سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا انتظام ہے۔ دیکھ کر دل خوش ہوگیا، خدا تمھیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔" میں نے عرض کی "مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا، یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے۔" فرمانے لگے "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی، وہ کہیں سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے۔ تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے، چلو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔""

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اُترے۔ نیر، علائی سالک اور حزین اُن کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا "بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر جان مخزون کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے، معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر اُن کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا، اب یاروں کو روتے ہیں، دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے مگر نام نہیں لکھا۔ مجھے یہ واقعہ اُن ہی کی زبانی معلوم ہوا سنکر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں مجھے یارانِ وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے۔ ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا۔" حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا "اے لیجیے مرزا صاحب وہ اُستاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں، دیکھیے آج کس کے چونچ مارتے ہیں۔" میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمٰن ہے، پورب کے رہنے والے ہیں، دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیشؔ کے ہاں ٹھہر گئے ہیں، اُن کے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا۔ اُنہی کی تجویز سے چگی داڑھی رکھی۔ سر منڈا کر کو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھی ہوگئے۔ انہی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے اور طائر الاراکین، شہیر الملک، ہُدہُد الشعرا، منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو اُن کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا، مگر بعد میں اُنھوں نے اُستادانِ فن پر حملے شروع کر دیئے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو، آخر آخر سب کو اُن سے کچھ نفرت سی ہوگئی اور بجائے دوسروں کا مذاق اُڑانے کے خود اُن کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو علانیہ اُن کی مدد کر نہیں سکتے تھے خود اُن میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دِلّی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے، تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ مُنھ آتے تھے۔ اسی لیے مولانا صہبائی کے مُنھ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سُن کر مرزا نوشہ مسکرائے اور کہا

بھی میں تو اُن کے مُنہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا۔ "ہر فرعونے راموسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹک گئے تو میں سمجھونگا کہ بڑا کام کیا۔" غرض یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اُستاد ذوق بھی اندر آ گئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ اُلٹ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور اُن لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جیسے کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں، چلو سلام ہو گیا، باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لیئے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، ڈاڑھی کلوں پہ ہلکی، ٹھوڑی پہ زیادہ۔ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے، شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہو گی۔ امیر تیمور سے لگا کر اس وقت تک انکی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس تھا لہ مگر اب کچھ دو رنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان

لہ اس مضمون میں جابجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اُس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں، اُن کی ٹوپی دنیا بھر سے جُدا تھی۔ نہ ترکی تھی، نہ تاتاری، کلاہ کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح کاٹا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرا اوپر کے چند وے سے (بقیہ برصفحہ ۴۴)

شکوہ کا اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جاکر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوکر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انھی کو دیکھ لیجئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲)

ذرا بڑا رہے۔ اسکے بعد چار کنگرے قائم کرکے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گرُج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چند شہ، کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملاکر سی لی، اندر استر دے دیا۔ چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہوگئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے جسکو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اسکا دمہ (گوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے۔ دمے کے اوپر چار پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے چاروں کو اس طرح ملاکر سیتے ہیں کہ چاروں کونے کمرک (کمرخ) کے نمونے کے ہوجائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دمے کو اونچا کرکے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور اُن کے سلجانے کے بعد جو پہل پیدا ہوئے ہیں اُن کو پھر کاٹ کر کلیاں ڈالدی ہیں، اس طرح بجائے چار پہل کی ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں خوبصورتی کے لیئے دمے کے کناروں پر پتلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے پٹی ہوئی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے۔ اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں، باقی لوگ اُن کو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اسکے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ

جو شاہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں اُن کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پیجامہ ہے جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُن کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳)

بائیں بھوں کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرق چین) ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کی ناپ کے برابر سی لیا، نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصے میں چنٹ دیکر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے، برخلاف اسکے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں، اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اسکی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے فصیل کے کنگرے۔ نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب چڑھا کر پہنی جاتی ہے، قالب چڑھا کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہے اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں۔ اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھا کر پہنتے ہیں۔

لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ دہلی کے انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لیے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لیئے آستینیں بہت چست رکھتے ہیں اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر اُلٹ لیتے ہیں۔ انگرکھے کے نیچے کرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعے والوں کے انگرکھے

خفتان، پاؤں میں گلبدنی یا غلطے کا ایک برکا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں اُنھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ داڑھی کو بھی خیر باد کہدیا ہے، چہرے کی ساخت سے اُن کو دہلی کا شہزادہ کہدو تو کہدو مگر لباس اور وضع قطع سے تو ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴)

کے اوپر جامہ دار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے، بہت تکلف کیا تو اس کے حاشیوں پر گوٹ لگا لیا۔ نہیں تو عموماً پتلی لیس لگاتے ہیں۔ بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے جسکو "عاشق معشوق یا چشمے" کہتے ہیں، اسکی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں۔ قلعے میں تو اسکو خفتان کہا جاتا ہے، مگر شہر والے اس سینہ کھُلے نیم آستین کو "شیروانی" کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر چوکور شالی رومال سموسہ کرکے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں "ارخ چین" (عرق چین) کہتے ہیں۔ کمر میں بھی بتی کرکے رومال لپیٹنے کا رواج ہے مگر بہت کم۔ پائجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے۔ اکثر گلبدنی، غلطے، مشروع موٹرے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک برہی کا پائجامہ پہنتے ہیں، مگر تنگ مہریوں کے پائجامے بھی چل نکلے ہیں۔ سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہوگیا ہے۔ پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہوگا جسکے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈھ، ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے، تیل پلاتے، مہندی ملکر باورچی خانہ میں لٹکاتے، یہاں تک کہ اسکی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہوجاتی اور وزن تو ایسا ہوجاتا گویا سیسہ پلادیا ہے۔ جو نکلتا ہوا اینٹھتا ہوا نکلتا ہے، جسکو دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر، بنے ہوئے ڈنڈ، شرفا میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی ذ نکلیگا جسکو کسرت کا شوق نہ ہو اور بانک، بنوٹ اور لکڑی نہ جانتا ہو، بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دیجاتی ہے، مقابلے ہوتے ہیں، واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

اُستاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جسکو جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُن کے خیال میں اسکو نہ بیٹھنا چاہیئے تھا تو بجائے اسکے کہ اُس کو وہاں سے اُٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اُسکو بٹھانا چاہتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا" وہ آکر اُن کے پاس پاس بیٹھ جاتا، اس سے باتیں کرتے رہتے، اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جسکو وہ خالی جگہ کے موزوں سمجھتے اُس سے کہتے "تشریف رکھیئے وہ جگہ خالی ہے" جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو اُستاد ذوق خوب سمجھتے تھے اس لیئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام اُنھوں نے خود کر لیا، مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے "صاحب عالم ادھر آئیے"۔ کسی سے، کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے، کہتے "بیٹھو، بھئی بیٹھو"۔ غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے اُستاد اور اُن کے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے، سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے۔ ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر

لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے۔ ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پدڑیاں جہاں جا ہا جھکڑا لے گئے اور پدڑیاں اُڑا دیں۔ ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ جھلڑ سے ایک بھی پھٹ کر نہیں جاتی۔ اُنھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اُڑیں، اُنھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

اُستاد ذوقؔ کو آئے ہوئی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آ پہنچے۔ اُن کے ساتھ نواب مرزا خاں داغؔ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی، چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم میں سانسلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدنی کلی پاجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال۔ ہیں تو ابھی نوعمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شہر بھر میں اُن کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ اُترے[1] اور اُتر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اُترے، ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہو گئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی چکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیئے ہوادار کے پیچھے تھے۔ اُدھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا اِدھر عصا بردار تو اِن کے سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لیئے

[1] مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد اُن کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا)

اس سلسلے میں یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈالکر کہا: " اجازت ہے ؟ " سب نے کہا " بسم اللہ، بسم اللہ " اجازت پاکر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کرکے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا " تشریف رکھیئے، تشریف رکھیئے " سب لوگ سلام کرکے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اُستاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہوگیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے، شامیانے کے پاس جاکر تسلیمات بجا لائے اور دوزانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اُن کے اُٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ[1] کو اُٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اُٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا " اے خوشنوایانِ چمن دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے اُستادانِ فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لاسکوں، صرف حضرت پیرو مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہوگیا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ محبوں! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لیئے کوئی " طرح " نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جیسطرح " طرح " کے

[1] نواب فتح الملک بڑے کٹے مسلمان تھے، کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے اسی لیئے سب قلعے والے اُن کو " مُلّا " یا " ملیٹا " کہا کرتے تھے۔

نکل جانے لئے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مُباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے، اُسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائینگے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے۔ لیکن اس مشاعرے میں، میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہو گی اور اسکے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دونگا۔" یہ کہکر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اُٹھا کر اُن کے سامنے لائے۔ اِنھوں نے بسم اللہ کہکر فانوس اُتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوبداروں نے شمعیں لیجا کر لگنوں میں رکھدیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے بآواز بلند کہا "حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔"

اس آواز کا سُننا تھا کہ ایک سناٹا ہو گیا۔ قلعہ والوں نے بٹیریں تھیلیوں میں بند کر کے تکیوں کے پیچھے رکھدیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اُگالدان، خاصدان اور پُن دھنیے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لیئے ہوئے قلعے سے آیا۔ اسکے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجا لایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی، وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی "حاضرین! حضرت ظلِّ سبحانی، صاحب قرانِ ثانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوشِ دل سے سماعت فرمایا جائے۔"

تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکالیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا، ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا اُستادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے مُنہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا، باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اُٹھایا۔ لیجیے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجیے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا۔ کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں، کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی، خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لیکر ادھر اُدھر دیکھا، مملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھکر کہا " صاحب عالم! ہمارا کیا مُنھ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف کر سکیں البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیجکر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہِ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔" مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا۔ اُس نے عرض کی " قبلۂ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیشگاہ عالی میں پہنچا دونگا۔" خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا " جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔" یہ کہکر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا۔ اُس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سُنائی:-

دل سے لطف و مہربانی اور ہے | مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے | عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب مرے رکتے ہیں شک | بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے اے دارا وہ کب ہوتے ہیں صاف | اُن کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھسپھسی تھی مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی، بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعہ والوں کو بُرا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنیوالے لوگ ہیں۔ ولی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواصی تو غزل پڑھ رخصت ہوا اور اب حاضرینِ جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اُس نے دونوں شمعیں لا شامیانے کے سامنے رکھدیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور اِدھر اُدھر نظر ڈالکر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں، البتہ جو کچھ بُرا بھلا کہا ہے وہ بہ نظرِ اصلاح عرض کرتا ہوں"

۱۔ غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا | درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
۲۔ حال کھل جائیں غیر کے سارے | پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
۳۔ درد کیا جسمیں کچھ نہ ہو تاثیر | بات کیا جسمیں کچھ مزا نہ ہوا
۴۔ وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف | تجھکو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
۵۔ شکوۂ یار اور زبانِ رقیب | کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا
۶۔ تم رہو اور مجمعِ اغیار | میرا کیا ہے، ہوا، ہوا نہ ہوا

۷۔ پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو رمز اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سُنکر دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سُبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صدرت سے آگے نکل آئے، مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو انھی دو شعروں کا رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا "سبحان اللہ! صاحب عالم! سبحان اللہ۔ واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزہ آگیا۔ استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانہ سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جُھک جُھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اُس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا، سامنے کی صف میں میاں یل کے آگے رکھدی۔ نام تو اُن کا عبدالقادر تھا مگر شہر کا بچہ بچہ اُن کو میاں یل کہتا تھا۔ اُن کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور[له] تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں

له اس غرور ہی نے آخر اُن کو نیچا دکھایا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں آکر خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گذرا۔ شیخو والوں کے اُستاد حاجی علی جان نے ایک پٹھہ تیار کیا، بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ تھا مگر داؤں پیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں یل نے حسب معمول شیخوں والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اُتار پینترا بدل سامنے آگیا اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں یل کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پوذنا میرا کیا مقابلہ کریگا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا اُستاد علی جان نے کہا "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے؟ یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے

نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) میں آکر خم نہ ٹھونکنا"۔ کہنے لگے استاد! جوڑ تو دیکھ لو، خواہ مخواہ اس لونڈے کو پسوانے سے حاصل؟" استاد نے کہا "میاں جو جیسی کریگا ویسی بھرے گا، دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا یہی ہوگا نا کہ ہڈی پسلی تڑوا کر آئندہ کو کان ہو جائینگے، بہرحال دونوں کے ہاتھ مل گئے اور تاریخ مقرر ہوگئی، اس مشاعرے کے دو چار ہی دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے، دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں پل کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی، پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگیئے پہن، چادریں پھینک دنگل میں اُترے۔ اُترتے ہی دونوں نے "یا علی" نعرہ مارا۔ دو چار ڈھیکلیاں کھائیں، کچھ پڑھ کر مٹی سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے آگئے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا، تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں پل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آگئے وہ چپٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انھوں نے۔ انھوں نے اسکا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاؤزوری کر کے اُس کو دبا تو لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اسکو دبا ہی بیٹھے وہ چپکا پڑا رہا انھوں نے ہتھیّے کس لیے۔ تھوڑی دیر تک اسکو خوب رگڑا وہ سہے چلا گیا انھوں نے پہلو میں اُکسکر اس کا سینہ کھولنا چاہا، وہ بھی موقعہ تاک رہا تھا، یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اُس نے ٹانگ پر باندھ جو اُڑایا تو میاں پل چاروں خانے چت جا پڑے لونڈا اُچک سینے پر سوار ہو گیا"۔ وہ مارا۔ وہ مارا" کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے دوڑ لونڈے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں پل کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اُٹھ چادر اوڑھ مُنہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے کیا گئے ہمیشہ کے لیے دہلی سے گئے۔ تھے بڑے غیرتمند وہ دن اور آج کا دن، پھر اُن کی صورت نظر آئی۔ خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

جواب میں اُن کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے تخلص رُیل، رکھا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا، ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی:۔

کہدو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اُس دبنگ سے

لب کا بڑھا دیا ہے مزا خطِ سبز نے ساقی نے پشت دی مئے صافی کو بنگ سے

دل اب کے بے طرح سے پھنسا زلفِ یار میں نکلے یہ کیونکہ دیکھیے قیدِ فرنگ سے

آجائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا یاری تو تم نے کی ہے رُیل اُس شوخ و شنگ سے

اُن کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اُٹھا، مرزا علی بیگ کے سامنے رکھدی۔ یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں، کسرت کا بھی شوق ہے، نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی۔ اُدھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی۔ "اوڑھنی لاؤ"۔ ایک نوکر فوراً گہرے سرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لیکر حاضر ہوا۔ نازنین نے لے بڑے ناز و انداز سے اُس کو اوڑھا ایک پلّو کا بکل مارا، دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑ لڑ کر اور اَڑ اَڑ کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ نرت ایسا پیارا کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جلانے کے لیئے سب کچھ کرنے کو تیار رہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزا آیا۔ مگر جو ریختے کے اُستاد تھے وہ خاموش بیٹھے سُنتے رہے۔ غزل یہ تھی:۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف ساجو لال تا کا

بڑا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو
نہیں ڈرنے کی میں بھی، ہاں، نہیں تاکا تو اب تاکا

اگر اے نازنیں تو دُبلی پتلی کامنی سی ہے
چھریرا سا بدن، نامِ خدا ہے تیرے دولھا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اُلٹی طرف کا۔

نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں، لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے، نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے اُستاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا ہے، کہ سبحان اللہ، لکھا ہے:۔

فقط تو ہی نہ میرا اے بتِ خونخوار دشمن ہے
ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اُٹھا کر عبداللہ خاں "اوج" کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ بڑے پُرانے ۴۰، ۴۵ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعے میں بھی اُن کی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں، خود ہی

نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت
پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرے کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آ جائیگا

۱۴ رجب سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے مشاعرے میں شعراء کی نشست کا نقشہ

مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آکر صف مجلس سے گزوں آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر استاد بھی اُن کو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل بوتہ ہے جو ان کو استاد نہ کہہ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ اِدھر انھوں نے شعر پڑھا اُدھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور اُن کے تیور بدلے۔ ان کے غصہ کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے۔ چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی، جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی،

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا | بے پل صراط اُتریں، یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھکو وحشت سرے نفرت | سُم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نعل اپنا
کسب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل | سانچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
چیچک کے آبلوں کی ہیں باگ موڑتا ہو | (رکھے) دیوی کے آستاں پر ہیں ہلال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اُچھل پڑے۔ کہنے لگے "واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے۔ بھئی واللہ الفاظ "رکھے" کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا" غرض سب اُستادوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیے اور یہ میاں اوج ہیں کہ پھول کر کُپا ہوئے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف "تمکین" کے سامنے آئی۔ اُن کی عمر کوئی ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی، مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ، سانولا رنگ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے غزل کہی تھی:-

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا — کس دل جلے کی یارخدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہوجیو ترا عشق بے حیا — آئین کونسا تھا یہ کیا رسم وراہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا — رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تمکینؔ کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا — جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی۔ قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا۔ اُستاد احسان نے کہا "میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو، کوشش کیے جاؤ، ایک نہ ایک دن اُستاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ بے اُستاد رہے تو بھٹک نکلو گے"۔ میاں تمکین نے مسکرا کر کہا۔ "اُستاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں، کل ہی انشاء اللہ اُستاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں"۔ اُستاد ذوق نے کہا "ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا، بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے"۔ یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد "تصویر" کے سامنے پہنچ گئی۔ اُن کو میاں بتن بھی کہتے ہیں، الف کے نام بے نہیں جانتے، مگر طبیعت غضب کی پائی ہے پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے، بعد میں اُن سے ٹوٹ کر اُستاد ذوق سے آملے بھاری بدن، منڈی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گہرا سانولا رنگ جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پائجامہ، اوپر سوسی ہی کا کرتہ، کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی۔ بچارے نیچہ بندی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پُرگو شاعر ہیں، لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لیے جو کچھ کہتے دل و دماغ ہی میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے، کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے اُستادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو

یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی:۔

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بے کار تو اپنی نہ گئی — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے آنا بھی نہ کھنچیے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ، واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی، غزل تمام ہوئی تو اُستاد ذوقؔ نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا "خاں صاحب یہ میاں بنّن بھی غضب کی طبیعت لیکر آئے ہیں، کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں، مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی، میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں میاں بنّن وہ کیا شعر تھا؟ میاں بنّن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل زبان پر آ گیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ لگی — پہلو سے دل میں، دل سے کلیجہ میں جا لگی

اور شعر یہ تھا۔

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلربا لگی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا "میاں بنّن! یہ خدا کی دین ہے، یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اس وقت دل خوش کر دیا۔"

ان کے بعد شمع محمد جعفر تاکشؔ کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں، بہت دنوں سے دلّی میں آ رہے ہیں۔ بچارے گوشہ نشین آدمی ہیں

شاعری سے دلی لگاؤ ہے، کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے — توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو، برائی تابش — وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی۔ مفتی صدرالدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

تابش کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں تغلق کے آگے گئی۔ خدا ان سے محفوظ رکھے بڑے چالاک آدمی ہیں، عبدالعلی نام ہے، مدراس کے رہنے والے ہیں کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے، بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدرآباد ہوتے ہوئے دلی آئے۔ ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر بیڑا کر دیا۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں، مگر دل کا خدا مالک ہے، شعر خاصہ کہتے ہیں۔ لکھا تھا

ختم شراب سے ختم کرو دور تو بن گیا — ساقی بنا دے ماہ پیالا اچھال کے
ہم مشربوں میں چل کے تغلق میکشی کریں — جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع[1] منشی محمود جان آوج کے سامنے گئی، ان کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اس جان جاں کے دیر ہے — کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جان جاں آتا نہیں — موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

ان کے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی۔ یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، کامل تخلص

[1] آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا الٹی جانب سے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ پہلے داہنی طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

کرتے ہیں۔ مشاعرے میں بھی اوپچی بن کر آئے ہیں۔ غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے ہیں۔ دیکھو تو مضمون میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے۔ ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں:-

مژگاں سے گر بچے دل، ابرو کرے ہے ٹکڑے
یہ بات میں نے کہکر جب اس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں۔ ۴۳، ۴۴ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سُنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ جسطرح میں تعریف کرتا ہوں۔ دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر بُرا نہیں کہتے مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے اور ہر شخص کے مُنھ سے بیساختہ واہ واہ نکلجائے آپ خود ہی اُن کا کلام دیکھ لیجیئے۔

تجھ کو اس میری آہ و زاری پہ — رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن — کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم — ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ اُن کے دل کو نہ لگی اس لیئے ذرا آزردہ سے ہو گئے۔
ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں۔ بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے، زبان پہ جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ

کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر کس کے پوتے ہیں۔

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم
یہ سر، یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔

میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھانند رقم کی باری آئی، ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی:-

بجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے
ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے
گیا ادھر جو گزر پھر ادھر نہیں آتا

ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے
نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اس کی انھوں نے بہت تعریف کی، مگر اس کے ساتھ، یہ بھی کہا "میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق ذرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی ہے۔ مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ اُن کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے، مگر مشاعرے میں اُنھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی، ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اُٹھا لیا۔ اُستاد ذوق نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجیے ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اسمیں اثر نہیں

قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں

قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں

سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی
اے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کرلی۔ میں تو اب بھی یہی کہونگا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

اُن کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں:۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا
جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا

کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا
منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا

ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکا ہے سر
اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا

مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا
اسمیں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا

اوروں کی تھا لطف سے تھا صورت نیاز
یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہئے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ اُستاد ذوق نے بھی کہا "بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اسکی عمر میں برکت دے، ایک دن بڑا نام

پیدا کریگا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہوگیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ اُن کا کہنا ہے سرکار سے خطاب خانی پایا ہے، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے، کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں، کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا، آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے، نہ آئیگا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے جلے ہونگے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہِ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں — نو آسماں ہیں، دو بھی نہیں چار بھی نہیں

ہے کسکو تاب شکوۂ دشمن کہ ضعف سے — لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں

جینا فراقِ یار میں وعدے کی لاگ پر — آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں؟ مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر، بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے انھی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں، بڑی پاٹ دار آواز ہے، پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُترا جاتا ہے۔ ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں۔ ہر شعر تعریف کے قابل تھا، غزل یہ ہے

ایک دن، دو دن، کہاں تک، تو بھی کچھ انصاف کر
یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہو گیا

ہے ترقی جوہر قابل ہی کے شایاں کہ ہیں
خاک کا پتلا بنا، پتلے سے انساں ہوگیا

کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب
اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہوگیا

پہلے دعوائے خدائی اُس بُتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں، رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے "واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا، شعر کیا ہے اعجاز ہے۔ یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ ہاں کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اُس بُتِ کافر کو تھا۔ کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا"۔ غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی، لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سُناتے، مزے لے لے کر جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش خاں تنویر کے سامنے گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہونگے۔ بادشاہ سلامت اُن کو بہت عزیز رکھتے ہیں، میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ اُن کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سُنی، غزل بھی معمولی تھی، صرف یہ قطعہ خاصہ تھا۔

جان کر دل میں مجھے اپنا مریض تپِ غم
کہتا لوگوں سے بظاہر بُتِ عیار ہی کیا

رنگ رخ زرد ہے، تر چشم ہے، لب پر دم سرد
پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزین کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ متین، اور وضع دار آدمی ہیں، عارف کے شاگرد ہیں۔ اُن کا ایک شعر بڑے مزے

کا ہے۔

سبو سے منھ لگا ئینگے اب اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھریے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل اُنھوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی، اُس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں — اللہ ری وسعتیں تری اتنی تنگنائے دل
جل جل کے آخر ش تپشِ غم کے ہاتھ سے — اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سُنا نہ تھا — اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جسکا باپ شاعر، جسکا بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر۔ وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعرا، نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعرا قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہو گا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ غزل تھی:۔

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ — ناخدا ترس تو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سرو پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر — نازِ ہر گل نہ اٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں، اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اسکو اب چھوڑتے جاتے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار اُن کے

سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا، اُنھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے، اُس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں، کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب نے کہا "ضرور فرمائیے" انھوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی:-

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے، سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے اِدھر یہ عالم طاری تھا، اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" یہ کہتے ہوئے اُٹھے اور اسی عالم بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں"۔

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجیے"۔ شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد ان کا

کیا رنگ جمتا۔ اوّل تو یہ نو مشق ہیں، مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے اوبتِ کافر اٹھا لیا
اس نازکی پہ بوجھ، یہ کیونکر اُٹھا لیا

بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا
کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھا لیا

پیرِ مغاں نے بسمل میکش کو دیکھ کر
شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

بہر حال کسی نے سُنا کسی نے نہیں سُنا، کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ اُن کی کوئی ۴۰ برس کی عمر ہو گی۔ صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے، ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے، انہی کے دادا میر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مار اٹھا۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، شعر بھی بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا:۔

۱۔ ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلّیِ دل
کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے

۲۔ شبِ وصال ہیں سُننا پڑا فسانۂ غیر
سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

۳۔ وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں
نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے

۴۔ میرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر
نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے

مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین
کہ سوجھتا نہیں اپنا مآل کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر ہو بیٹھے۔ اُستاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی، اُنھوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی چشم کی، زلف دوتا کی
سے ایک دل جفا کس کس بلا کی

کب اُس گل کی گلی تک جا سکے ہے ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بدل تمہیں بھی دن لگے، قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل پھبسی تھی، بھلا اسکی کون تعریف کرتا۔ ہاں اسکے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزا آگیا میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے شاگرد۔ چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کتاں وار جگر چاک ہوا پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہیئے اس بت کو مشابہ کس کے دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا
عہد پیری میں جوانی کی اُمنگ آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع اُستاد ذوق کے اُستاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بچارے بڈھے آدمی ہیں شاہ نصیر کے شاگرد ہیں، مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں اُستاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا اُستاد کہا کرتے ہیں اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اُسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں، مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں غزل جو پڑھی تو واقعی اُس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

اُستاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی غرض جتنے

استادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی۔ وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں۔ ذرا کسی نے واہ واہ کی اور اُنھوں نے استاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھا شعر یوں کہتے ہیں" وہ بچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے، اُن کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا مگر اُنھوں نے روک دیا۔

خدا خدا کر کے اُن سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگزنڈر ہیڈرلے ہے۔ قوم کے فرانسیسی ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے یہیں تربیت پائی، اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر الور گئے۔ کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے، ڈاکٹری بھی جانتے ہیں، شعر و سخن کا بہت شوق ہے عارف کے شاگرد ہیں، جہاں مشاعرے کی خبر سُنی اور دہلی میں آموجود ہوئے لباس تو وہی فوجی ہے، مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے، شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرم روِ راہ معاصی ہوں جہاں میں ۔۔۔ گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی ۔۔۔ ہاتھوں سے مزہ دیکھ ذرا جیب دری کا
جہلم کو عیادت کے لیئے وہ مرے آئے ۔۔۔ آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بیخبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی

بچارے غریب صورت، فرسودہ لباس، کوئی ۶۴، ۶۵ برس کے آدمی ہیں، شاہ نصیر کے بڑے چاہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے جاتے تھے، اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کر کے قدم شریف میں جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُن کو دہلی کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے

کا انداز بھی نرالا ہے، اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر جڑی ہے حضرتِ دل — پاؤں پر اس کے سر دھرو تو سہی
جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں — ق — تم گلے سے مرے لگو تو سہی
بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں — خیر ہے کچھ، پرے ہٹو تو سہی
عیز کے کل وہ لگ کے چھاتی سے — ق — مجھ سے کہنے لگے سنو تو سہی
اس لیے اُس کے ہم گلے سے لگے — کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیئے تھی ویسی نہیں ہوئی، کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بُرے بھلے کی تمیز دشوار ہوگئی تھی، اس کے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہوگئیں، نہ کسی نے شوق سے سُنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلّی کے بعد شورؔ نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں، قوم کے عیسائی ہیں اور نام جارج پیس ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں۔ ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں، بہت غنیمت ہے۔ غزل:۔

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض — دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا — ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا — جس طرف سر جھکا وہی بس سجدہ گاہ تھی

ان کے بعد محمد عسکری نالاںؔ کی باری آئی۔ بھلا اس نوّے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سُنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی باوا آدم کے وقت کے

کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے　　شبِ وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگماں ہوں کہ اس بت کے سایہ پر بھی مجھے　　رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاں نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھلکر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں، بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑیں، بعض اٹھ اور پانی کا چھپکا منہ پر مار آ بیٹھے، کیسی نیند اور کہاں کا سونا، میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے، اُنھوں نے بھی پہلو بدلا۔ اُستادانِ فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی، نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا " میر صاحب یہ ٹھیک نہیں آپ تو بیچ میں آ کر پڑھیئے"۔ یہ کہکر چوبدار کو اشارہ کیا، اُس نے دو شمعیں اُٹھا وسطِ صحن میں رکھدیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا، کونسا مشاعرہ ہے جو اُن کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا، کونسی محفل ہے جہاں اُن کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آ جاتی۔ اُن کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں ہم نے تو جب سُنا اُن کا نام میر صاحب ہی سُنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے۔ بڑے سوکھے سہمے آدمی ہیں، غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی، بٹیا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت، اونچا قد، غرض ان کے حلیے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھیے تو پورا پورا پتہ دے۔ نہایت صاف ستھرا لباس، سفید ایک بر کا پائجامہ، سفید کُرتہ اس پر سفید انگرکھا، سر پر ارخچین (عرق چین) ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی تھی۔ مگر جب

غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا کوئی اُن سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے تھے کہ مُنہ پھر جائے اس سے اُن کو غرض نہ تھی کہ جواب بیٹھا بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں تمکین سے لیکر بادشاہ سلامت تک اُن کو چھیڑتے تھے۔ اُنھوں نے نہ اِن کا بُرا مانا نہ اُن کا، جواب دینے میں نہ اِن سے رُکے نہ اُن سے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہہ پڑھتے تھے۔ لکھکر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی، صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لا شعر کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ بھلا کب دبنے والی آسامی ہیں، چوگُھا لڑتے۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا۔ معترض کو ڈانٹا، میر صاحب کا دل بڑھا یا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے اُلجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سُن لیتا تو مدرسے سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب[1] نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور

---

[1] غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے۔ اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں۔ انہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کیے گئے۔ تذکروں میں تو اُن بیچارے کا کیوں ذکر آنے لگا۔

کہا "حضرات! میں آج میاں ہد ہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا اپنے منھ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔"

میاں ہد ہد سے سب جلے بیٹھے تھے، اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے، سب نے کہا "ہاں میر صاحب ضرور فرمایئے" میاں ہد ہد حکیم آغا جان عیش کے پٹھو تھے اور انھی کے بل پر پھدکتے تھے، اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہد ہد کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں، دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے بھلا میر صاحب کی بحر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے۔ اور تو کچھ بن نہ پڑا، میاں ہد ہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر ڈالتے ہیں تو ہد ہد ندارد ہیں، بہت گھبرائے، ادھر دیکھا ادھر دیکھا، جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں۔" سب نے کہا "ہیں! میر صاحب! یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا، پڑھیے، میر صاحب! خدا کے لیے پڑھیے۔ سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائیگا۔ زبان ادھوری رہ جائیگی" میر صاحب نے کہا، "نا بھئی نا میاں ہد ہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا ان کے منہ پر کہتے، ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں، غیبت ہے، اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا انھوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی، کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے

بس اتنا تو معلوم ہوا کہ تیر، بیر، کھیر، قافیہ۔ اور "ہے" ردیف ہے۔ اسکے علاوہ میں تو کیا، خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ اُنھوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا، اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا "اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحر طویل میں جا پڑا۔" میر صاحب نے کہا "مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سُنی سُنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول پڑھیے، مطول[1] جب معلوم ہو گا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہیں۔" مولوی صاحب بڑے چکرائے، کہنے لگے "میر صاحب! بھلا مطول کو بحر طویل سے کیا واسطہ، مار دل گھٹنا پھوٹے آنکھ، آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔" میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے کہا "مولوی صاحب! مطول میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے، آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔" بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے۔ "جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھے ہونگے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اسکے دو دور کرتا ہوں، کل ہی اسکی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا، ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحے میں لکھا، وہ تو کہو کہ بیاض کے

---

[1] علم معانی و بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرعہ ختم ہوا، ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔" مرزا نوشہ نے کہا "میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو، اُس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے۔ یہ بڑی بڑی اور یہ یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں، بحرِ طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحرِ طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے۔" میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور بگڑ کر کہا "واہ مرزا صاحب سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے، رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتائیے تو سہی کونسی کتاب میں ہیں؟" یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین[1] پڑھیے جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کونسی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آکر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا "حضرات! غزل ختم ہوئی۔" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں، بے مقطع کی یہ کیسی غزل۔" میر صاحب نے فرمایا "مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا

[1] اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی (رح) کی ایک مشہور تصنیف ہے جسکو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

چاہے کہ یہ غزل میری ہے، ہمیں اسکی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہوگیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی" یہ کہتے کہتے اُنھوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ایک شمع اُٹھاکر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھدی گئی یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے۔ لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ	قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہوگیا
ناصح کی بات سُننے کا کسکو یہاں دماغ	تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہوگیا
اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں	ایک پارسا، سُنا ہے کہ میخوار ہوگیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اُتار دیا تھا، اسلئے اس غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی، یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے۔سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت، اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارہ دار پیجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے، آواز بڑی دلکش اور ترطرہ زادا خوب ہے، غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ! واہ! کہتے ہیں:-

بزم اغیار ہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے	ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے ورنہ تو پردہ اُٹھا دے تو، تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزہ ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا چاہتا ہوں یوں ہی ہر روز خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بُت یا بُت میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں، وصل سے میں درگزرا کچھ تو ہو، جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے
ہو نہ ہو، بس میں کوئی، کچھ نہیں اس کی پروا دلِ بیتاب پہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ، اللہ! در و دیوار سے بے خودی برس رہی تھی۔ جب یہ مصرعہ پڑھا کہ "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی۔ اور تو اور اُستادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔

ابھی ان کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ شوق کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظلِ سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا، زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے، گا کر غزل پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دلِ مضطر کہ تیر کا باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا بیٹھا جائے ہے ظاہر میں تو ابھی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دئے ہیں، آخر کیوں نہ ہو، قلعہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ، اس پہ سفید لباس، بغل میں انگوچھہ، کندھوں پہ سفید کشمیری رومال۔ بس جی چاہتا

تھا کہ ان کو دیکھے ہی جائیے۔ شمع سامنے آئی تو اُنھوں نے عذر کیا کہ میں اب سُنانے کے قابل نہیں رہا۔ سُننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو اُنھوں نے یہ قطعہ پڑھا:۔

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت　　جو اُٹھ کھینچیں واماں، ہم اس دلربا کا
سر راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے　　کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ " نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی، لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ " نہ ہاتھوں میں طاقت" کہکر ہاتھ اُٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی اُٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے، جیسے کوئی بے دست و پا سر راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے، اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منھ سے تعریف کے بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا۔ کہ " اللہ والی ہے بے دست و پا کا۔" اُستاد ذوق نے کہا " اُستاد! یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے، سبحان اللہ! کیا مؤثر کلام ہے۔ ہم دنیا داروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لیئے میر درد ہی جیسا اُستاد چاہیئے۔"

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون سُنتا، یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے، اونچا قد، سفید پوش، ثقہ صورت آدمی ہیں، پہلے نظام الدین ممنونؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا:۔

کچھ وجہ نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف　　کافی ہے بیاں نالۂ بے ربط درا کا

سجدے میں گرے دیکھ کے تصویرِ بت شکی معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی،
۳۰-۳۲ کا سن ہوگا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ انہی کے ساتھ مشاعرہ میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ میخانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ! ہائے لکھا ہے:-

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ ساقی اگر نہیں ہے، نہ ہو، مے سے کام ہے
بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ یہ خم ہے یہ سبو ہے، یہ شیشہ یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا، نہ کلام ہی اچھا، نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا، شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کردیں، خوش ہوگئے۔ غزل یہ تھی:-

ترے بیمارِ ہجراں کا ترے بن یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں اُن کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے، اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سُنی جاتی، اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ اُن کو دور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک،

چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ، اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی داڑھی، کلّوں پر کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، سر پر خشخاشی بال کوئی ۳۰ سال کی عمر۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں لباس اُن لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ مہری کا پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال، شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے بھی انگرکھے کی آستیں اُلٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے اُستاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ اودھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو اُنھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے؟" مرزا فخرو نے کہا "ہاں میاں سالک پڑھو، آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے" سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ اُلٹا پلٹا، پھر ایک بار سنبھل کر کہا، "عرض کیا ہے"

انتہا صبر آزمائی کی ۔۔۔ ہے درازی شب جدائی کی

ہے بُرائی نصیب کی، کہ مجھے ۔۔۔ تم سے امید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے ۔۔۔ داستاں اپنی جبہ سائی کی

ہے فغاں بعد امتحان فغاں ۔۔۔ پھر شکایت ہے نارسائی کی

کیا نہ کرتا وصال شادیٔ مرگ ۔۔۔ تم نے کیوں مجھسے بیوفائی کی

راز کھلتے گئے مے سب پر ۔۔۔ جسقدر اس نے خودنمائی کی

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں ۔۔۔ بندے بندے میں بو خدائی کی

رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک ۔۔۔ آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد

ملتی۔ استاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا "واہ میاں سالک کیا کہنا ہے سب ہی جبہ سائی باندھتے آئے ہیں، تمھاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا، کیا کلام ہے، کیا روانی ہے، سبحان اللہ" حکیم مومن خاں نے کہا "میاں سالک! یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمھاری "عمر بار سائی" کو بہت دن پڑے ہیں، ابھی سے تو بڈھوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔" میاں سالک نے جواب دیا، اُستاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہوگیا، دیکھیے بڑھاپا دیکھنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں، پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے، ہم نہ رہینگے مضمون رہ جائیگا۔"

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رُکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴، ۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں مگر پھیکے، ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بتخانے میں تھا یا کہ میں کعبہ کے قریں تھا — اے زاہدِ ناداں تجھے کیا، ہیں میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا، یہیں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں — ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں اُن کے گانے میں مزا آگیا۔ گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے، مگر اُستادانِ فن اس کو پسند نہیں کرتے۔

ان کے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائی کے سامنے آئی۔ اُنھوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سُنائی۔ علائی مرزا غالب کے بڑے

چاہیتے شاگرد ہیں، ابھی نوعمر ہیں، شعر اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کس کے شاگرد ہیں۔ غزل دیکھ لو اُستاد کا رنگ غالب ہے۔

آوارگانِ گلکدۂ آرزو - حاشا اگر تمھیں سرِ سیر و فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشمِ دل - کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدح موج خیز رنگ - وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
کل چرخ کل ہے سنگِ جفائے سپہر سے - گویا کہ غمکدہ کا شکستہ ایاغ ہے
اور لالہ تندیادِ حوادث سے خاک و خوں - گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز - اُس جا پہ آج دل شکن آوازِ زاغ ہے
مغرورِ جاہ سے یہ کہو تم علاؔئیا - کل ایک سطح خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھلکر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزا۔ نہ الفاظ کی بندش اچھی، نہ مضامین میں کوئی خوبی، تعقیدوں سے اُلجھن پیدا ہوتی تھی، اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھدینا کافی سمجھتا ہوں۔

باز آ، ستا تو مجھکو بہت عشوہ گر نہیں - کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں
گو نزع میں ہوں میں ترے بن اے جانِ من - کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں کے پڑھنے کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں، اُردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں، لکھا تھا:۔

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں - ساقیا! ایجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر - گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنیٔ باقی — کسی صورت نہیں زوال ہمیں
ترے غصے نے ایک دم میں کیا — مُردۂ نہ ہزار سال ہمیں
طالع بد سے نیّر رخشاں — اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں، بٹیر بیا لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں، پہلے احسان کے شاگرد تھے، اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے، کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی، لکھا تھا:-

لبسان طائر رنگ پریدہ وحشت سے — کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے، گر ہم — یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گندھی تھی کوزے بدست تشنہ لب کی خاک — کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا
بذوق ناز کو دے رخصتِ جفا کہ یہاں — ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہی جنگ و راز دنیا — اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہوا اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آہی گیا، بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا، اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی:-

اُٹھتا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں — پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اُس کا گھر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے سے ڈر نہیں — خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں — اپنے ہی جبکہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی، اُستاد احسان نے کہا "میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہوگیا ہوں، لاکھوں شعر سُنے، لاکھوں سُنائے، مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہوگیا"

میاں عارف کے بعد شمع مرزا اعلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی، یہ شہزادے ہیں، احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہونگا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہے
حشر سے پہلے میسّر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطر زاہد و شیخ
دیر میں بھی تھی سد راہ خصت دیدار مجھے

جنس دزدیدہ کے مانند ہوں اچھا دُرِّ جان
کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے

راز دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور کی یاں
کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں، حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیور علم سے آراستہ اور لباس کمال سے پیراستہ، صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں، طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ۔ میانہ قد، خوش اندام، سر پہ ایک ایک اُنگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سُرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کُرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے ان کے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے۔ میاں ہدہد کو پال کر انھوں نے سب سے بگاڑ لی۔ شروع شروع میں تو اسکی واہی تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا لیکن جب اس نے اُستادوں پہ حملے

شروع کیے۔ اس وقت سے ہد ہد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہوگئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انھوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا کہ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مملوک العلی نے کہا "حکیم صاحب، شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں، پھر اپنے ساتھ ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا۔" مومن خاں نے کہا "بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی شاعرانہ تعلی معلوم ہوتی ہے۔" بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب نے ہد ہد کے مقابلے میں جو اعلان جنگ کیا تھا وہ سن چکے تھے، اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی

صلح ان سے ہمیں کیے ہی بنی — دل یہ جھگڑا اٹھا دل دیے ہی بنی
زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے — ہاتھ سے اس کے مے پیے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار — پاس اپنے بٹھا لیے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوقِ ظلم اے عیش — ان جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صلِّ علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبار کدورت دور کر دیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے

تھے، نہ ان سے کسی کو رنج رہا اور نہ اُن کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہدہد کچھ چھیڑ جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا اُنھوں نے پہلے ہی اس پھیرو کی زبان بندی کر دی۔ خیر رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیا کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی اُن کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسا نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو اور ظریف آدمی ہیں۔ کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے۔ اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں، شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر داڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا سا۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی، اب اپنا کلام استاد ذوقؔ کو دکھاتے ہیں شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں، پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت نہیں کرتے، زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی حیا ترسا ز فرقت ہے ‏ رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے

ہو چکا وصل، وقت رخصت ہے ‏ اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا ‏ ظلم کرنا تمھاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہی رخت بدوش ‏ ہر نفس بانگِ کوس حالت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے ‏ دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ ‏ آج اُس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی۔ سانس کو مؤنث باندھ گئے"۔ حیا نے جواب دیا۔ "جی نہیں قبلہ میں نے تو استاد ذوق کی تقلید کی ہے، وہ فرماتے ہیں "سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد"۔ بھلا صاحب عالم[1] کب چوکنے والے تھے۔ کہنے لگے "بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے، وہ جو چاہیں لکھیں، یہ بتاؤ قلعے میں سانس مذکر ہے یا مؤنث"۔ بچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں ہزاروں شاگرد ہیں، اکثر ریختہ کہتے ہیں، ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں، مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی اُن کی کوئی غزل دیکھی نہ سُنی۔ اس مشاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
مردمم و در چشم مردم عالمے تاریک گشت من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار اوست جلوہ و در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد حور و من در ہجر دوست داغ بر دل بُردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباش مے ز خونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے مُنہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے

---

[1] قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا تھا۔

میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اہا ہا ہا! زبان کا لطف اُٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیرؔ کو سنیئے۔ ابھی ۳۰، ۳۲ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ۔ اُستاد ذوقؔ کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی طبیعت اس بلا کی ہے، قد خاصہ اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن، گول داڑھی، نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹھے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی:-

جبیں، اور شوق اسکے آستاں کا — ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے — سراغ نقش پا ہوں کارواں کا
رہے پابند دل کے دل میں ارماں — قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اُٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے بار منت پاسباں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دلِ بیتاب نے وہ بھی مٹایا، — کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا
ظہیرؔ آؤ چلو اب میکدے کو — نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور اُستادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیرؔ کا دل غنچے

کی طرح کھل گیا، تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا سلام کرتے کرتے بچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہونگے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ اُن کا کیا کہنا۔ یہ اُستادانِ فن میں شمار کیے جاتے ہیں، مومن کے شاگرد ہیں مگر خود اُستاد ہیں۔ اُنھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی۔ یہ سُنکر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سُنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی، انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی:۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور یہ سب سے علاحدہ آئینہ میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول کیا فائدہ ہے، موج اگر ہے سراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے جوں آفتاب روشنیِ آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ، شوخ طبیعت زباں دراز ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو، مگر حضور اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا مُنھ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نو مشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں مگر جب اُستادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے بجائے متانت

زیادہ آجاتی ہے۔ اُستادوں کے اُنھیں شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابل تعریف ہوں۔ اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کردیجائے تو اس سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جسکو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اسکی تعریف ہونی چاہیئے۔ شعر پڑھکر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف، اور وہی داد بھی دیتے ہیں، مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اُٹھاتے، کچھ حاصل بھی کرلیتے ہیں، اور اُن کے لیئے یہ غزلیں اُستاد کی اصلاح سے کم فائدہ مند نہیں ہوتیں۔

اُن کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابرؔ کی باری آئی۔ یہ کوئی ۴۰ برس کے ہونگے، ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے، خود اُن کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے، شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لیکر یے تک مولانا صہبائی کا قلم ہے، یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے اپنے حالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں، وہ نقل کرتا ہوں۔

قطعہ

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیرؔ و ممنونؔ
ہوئی احساں سے پر اصلاح طبیعت میری

پھر ہوا حضرتِ صہبائی کی اصلاح کا فیض
طبع یاریگ ہوئی ان کی بدولت میری

اور ہم بزم رہے مومنؔ و ذوقؔ و غالبؔ
اوستادوں ہی سے ہردم رہی صحبت میری

ہند کا فضل و ہُنر ذات یہ ہے جن کی تمام
مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری

منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشاء
کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر اُن کو استاد کہو یا جو جی چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے، مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں، مگر سارا شہر اُن کو اُستاد مانتا ہے، ہونگے، ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی:۔

نظارہ برق حسن کا دشوار ہو گیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہو گیا
محفل میں، میں تو اس لب میگوں کے سامنے — نامِ شراب لے کے گنہ گار ہو گیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہِ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہِ رخِ یار ہو گیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی — عاصی گنہ نہ کردہ گنہ گار ہو گیا
اسکی گلی میں آن کے کیا کیا اٹھائے رنج — خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب — قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔ اس پایہ کے عالم شاعر نہیں ہوتے۔ اور ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں مفتی صاحب کے جتنے شاگرد وحید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ اُن کے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پایہ کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز بھی ذرا نیچی ہے لیکن اُن کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے۔ اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں، ہاں مرزا نوشہ اُن سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو! کیا پختہ کلام ہے:-

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں — کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
شب اُسکو حالِ دل نے جتایا کچھ اس طرح — ہیں لب تو کیا، نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کشتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اُس سے کچھ میں، نکلتا ہے منہ سے کچھ　　کہنے کو یوں تو ہے کی زبان او زبان نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو　　مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے، مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا، دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو اُستادوں میں جگہ ملی تھی مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہوگئے۔ ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجیئے اور داد دیجیئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں　　ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن　　لطف سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی　　شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں　　وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیئے میکشوں سے لطفِ شراب　　یہ مزا پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک　　وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہوں　　لطفِ عمر دراز کیا جانیں
جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے　　آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ، اللہ، وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر، وہ الفاظ کی نشست وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھولی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی، ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہوگیا ہو، اور

کوئی نہ تھا جسکے منہ سے جزاک اللہ، سُبحان اللہ اور صلِّ علیٰ کے الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہوگئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی۔ اُس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس ریختے کے اُستاد کے کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہوگئے اُنھوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چُنٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی:-

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ — دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی — ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر — یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے — اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اُس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغِ خلد ہے — کس جائے مجھکو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی، بت و بتخانہ چھوڑ کر — مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالمِ محویت میں بیٹھے تھے، وہ خود بھی اپنے کلام مزا لے رہے تھے۔ جس شعر میں اُن کو زیادہ لطف آتا تھا اُسکو پڑھتے وقت اُن کی اُنگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں بہت جوش ہوا تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دیکر مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جُدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے

تھے، اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سُن کر مسکرائے اور کہا "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ　　تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

اُن کے بعد شمع اُستاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو بجلی سی بدل کچھ سے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر اُستاد ذوق کو۔ ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو اُنھوں نے متوجہ کیا۔ اسکو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا، مگر ان کی اُستادی کی داد دینی چاہئے کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مُرصّع کہہ گئے ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں اے دل محزوں　　نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رُلائے خدا

بتو! بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دو گے جواب　　خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ہائے خدا

رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف　　جو اس پہ تو نہیں راضی، نہ ہو رضائے خدا

بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان　　یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی، شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں۔" یہ کہہ کر ایسے دلکش اور مؤثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل سرد ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پُر درد تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو

اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزل تھی :-

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غزل پڑھ کر مُسکرائے اور کہا " اب اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر اُن سے خدا سمجھے "۔ حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے " مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے "۔ غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا اور شمع استاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ اُستاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا " صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی۔ لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی، شب ہجر کا مزا آ گیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہو گیا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کر دوں "۔ مرزا فخرو نے کہا " اُستاد! آج کا مشاعرہ سب بند دں

سے آزاد ہے۔ غزل پڑھیے، رباعی پڑھیئے، قصیدہ پڑھیے۔ قطعہ پڑھیئے۔ غرض جو دل چاہے پڑھیئے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیئے ضرور۔" استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور اُن کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب اگر تھے — مری جاں سے ترے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سُن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھکو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمنٰی فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحبا بر وقت بولا — تیری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی :-

"اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے مُنھ سے نکلا۔ "تری آواز مکے اور مدینے۔" اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا "صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے" یہ کہکر اُنھوں نے دونوں شمعوں کو جو چلکر کھاکر اُن کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا تھا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی "حضرات مشاعرہ ختم ہوا۔" یہ سُننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے اور پھر سب ایک کر کے رخصت ہوئے۔ آخر میں ہمیں اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین! یہ تمھاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بہ خیر و خوبی ختم ہوا۔ تمھارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا اچھا خدا حافظ۔"

تقدیر

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے روز سب سامان اُٹھ گیا۔ اور پھر وہی چھاپے خانہ کی گھڑ گھڑ

اور پریشانیوں کی گڑبڑ شروع ہوگئی۔ میں نے دوسرے مہینے پھر مشاعرہ کا اعلان کیا، اشتہار بھی تقسیم کیے، مگر گنتی کے آدمی آئے۔ آخر یہ مجلس بند کرنی پڑی۔ کچھ تو مطبع کے کام میں نقصان ہوا، کچھ ملازمین پیشگی رقمیں دبا بیٹھے، غرض تھوڑے ہی دنوں بعد میرے دو چار جاہل شرکا نے مجھ سے فریب کرکے مطبع چھین لیا۔" ہرچند کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر دعویٰ کروں، حاکم بے شک میرا انصاف کرے گا، لیکن چند صدمات پڑ جانے کی وجہ سے وہ ارادہ بھی پورا نہ ہوا۔" اس مشاعرے کی کیفیت کے مسودات پڑے رہ گئے ہیں، دیکھیے کب چھپتے ہیں اور کون چھاپتا ہے۔ فقط

میں چھاپتا ہوں میرزا صاحب اور لیجیے یہ چھاپ دیا۔

حسن نظامی

تمت

۷۸۶ — ہو الکل — یا معین
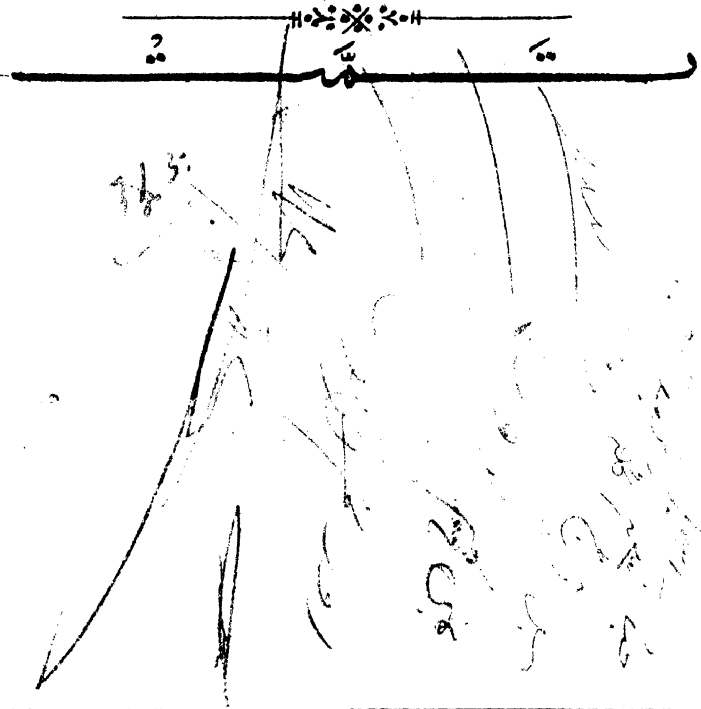
غدر دہلی کی تاریخ کا بارھواں حصہ

غدر کا نتیجہ

غدر کے زمانہ کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ

مع

تمہید و تشریح حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

سید ابن عربی

کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی نے

دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں چھپوا کر شائع کیا

طبع اول — مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی — قیمت ۸ر

لال قلعہ دہلی
کے
وائرلیس کے نام

تاریخ غدر دہلی کا یہ بارھواں حصّہ "غدر کا نتیجہ" دہلی کے لال قلعہ میں گڑے ہوئے اُن اونچے اونچے چھ کھمبوں کے نام معنون کرتا ہوں جن کے ذریعہ بغیر تار کے تمام دنیا سے خبریں آتی ہیں۔ کیونکہ یہ وائرلیس یعنی آلات بے تار خبر رسانی دہلی کے لال قلعہ میں کبھی نہ گڑ سکتے اگر غدر نہ ہوتا۔ گویا وائرلیس کے یہ کھمبے غدر دہلی کا ایک نظر آنیوالا نتیجہ ہیں اور یہ کتاب غدر کا نتیجہ نام رکھتی ہے تو غدر کے نتیجہ کے نام ہی منسوب ہونی چاہیے۔

حسن نظامی

۱۸۵۷ء

غدر دہلی کی تاریخ

کا

بارھواں حصہ

غدر کا نتیجہ

دیباچہ مجھے ایک قلمی کتاب شمس العلماء مولانا ضیاء الدین احمد صاحب مرحوم دہلوی کے صاحبزادہ سے ملی جو فارسی زبان میں لکھی اور جس میں نواب غلام حسین خاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کے حالات غدر تحریر کئے ہیں۔ یہ کتاب دو سو صفحے سے زیادہ تھی کیونکہ قدیم زمانہ کی طویل انشا پردازی اس کتاب میں استعمال کی گئی تھی۔ میں نے ترجمہ کرانے کے وقت صرف غدر کے حالات کے لیے عبارت آرائی ترک کر دی۔

میں نے اس سے پہلے گیارہ حصے غدر دہلی کی تاریخ کے لکھے اور شائع کئے ہیں پہلے حصہ کا نام بیگمات کے آنسو۔ دوسرا انگریزوں کی بپتا تیسرا محاصرہ دہلی کے خطوط چوتھا بہادر شاہ کا مقدمہ۔ پانچواں

گرفتار شدہ خطوط۔ چھٹا غدر کے اخبار۔ ساتواں غالب کا روزنامچہ غدر۔ آٹھواں دہلی کی جان کنی۔ نواں دہلی کا آخری سانس۔ دسواں غدر کی صبح شام۔ گیارہواں دہلی کی آخری شمع۔

جب اس فارسی کتاب کا اردو ترجمہ تیار ہوا تو میں نے نام رکھنے کے متعلق عرصہ تک غور کیا تو پہلے غدر کی پھانسیاں نام تجویز ہوا کیونکہ اس میں پھانسیوں کا ذکر زیادہ ہے۔

مگر کتاب چھپنے کو گئی تو اس نام پر اعتراض ہوا اس لئے

"غدر کا نتیجہ"

نام رکھ دیا گیا۔

امن کی قدر یہ کتاب اگرچہ ایک ایسے صاحب نے لکھی ہے جو برٹش گورنمنٹ کے پنشن خوار تھے اور اس وجہ سے انھوں نے بعض جگہ برٹش گورنمنٹ کی حمایت میں ذرا مبالغہ بھی کیا ہے۔ تاہم انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے دلوں میں امن پسندی پیدا ہوتی ہے۔ اور پڑھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جب کسی ملک میں غدر اور فساد اور بے امنی پیدا ہوتی ہے تو گناہ گار اور بے گناہ دونو مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ اور شریر لوگ ذاتی عناد و حسد کی وجہ سے موقع ملنے پر بے گناہوں کو جان اور مال کا نقصان پہونچانے میں دریغ نہیں کرتے۔

چنانچہ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ بعض خود غرض مخبروں نے برٹش حکام کو ان لوگوں کے متعلق باغی ہونے کی اطلاعیں دیں جنکو مصنف کتاب بھی باوجود خیر خواہ گورنمنٹ ہونے کے باغی نہیں سمجھتے تھے۔

بہرحال میں غدر کی تاریخ کا یہ بارہواں حصہ بھی اسی نیت سے شائع کرتا ہوں کہ

ہندوستان کے باشندے امن کی قدر کریں۔ اور بے امنی کے کاموں سے علیحدہ رہیں۔ اور اس کتاب کے واقعات ان کے دل و دماغ پر امن پسندی کا اثر پیدا کریں۔

نئی معلومات میں نے اس کتاب کے ساتھ حاشیہ پر کہیں کہیں نئی معلومات کے نوٹ بھی لکھے ہیں۔ اور یہ بھی کوشش کی ہے کہ پھانسی پانے والے اشخاص کی اولاد میں اگر آج کل کوئی باقی ہو تو ان کا ذکر بھی اس کتاب میں آجائے۔ اس کی تحقیقات میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی کیونکہ اب غدر کے زمانہ کے بہت تھوڑے آدمی باقی رہ گئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ مجکو بمشکل دو چار آدمی ایسے ملے جنھوں نے پھانسی یافتہ اشخاص کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔ پھر بھی کئی نام ایسے رہ گئے جن کی نسبت مجھے کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ کہ وہ کون تھے۔ اور ان کے پس ماندوں میں کوئی اب بھی باقی ہے یا نہیں۔

مصنف پر غلبۂ ذاتیات میں اس کتاب کے مصنف کی تعریف کرتا ہوں کہ ان کی اس کتاب سے ہم لوگوں کو اور آیندہ نسلوں کو ان حالات کا علم ہو گیا جو پہلے نہ کسی تاریخ میں تھے نہ سب کو معلوم تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا افسوس ہے کہ مصنف نے بعض مخبروں کا تذکرہ کرتے وقت غالبًا ذاتی اسباب کی بنا پر اپنے خاندان کے چند افراد کا نام بھی لکھ دیا۔ جن کی نسبت ذاتی طور سے مجھے معلوم ہے کہ وہ بے گناہ تھے۔ یعنی انھوں نے ہندوستانیوں کی مخبری نہیں کی۔ اور ان کو پھانسیاں نہیں دلوائیں۔ اُن میں سے ایک شخص ایسے بھی تھے جو آخر زمانہ میں دہلی کی سکونت ترک کر کے میرے ہاں درگاہ شریف میں آ گئے تھے اور یہاں انھوں نے ایک

مکان بنا لیا تھا اور اس میں رات دن رہتے تھے۔ اور میں بچپن میں ان کے پاس کھیلا کرتا تھا۔ ان کی عبادت اور ان کی پرہیزگاری اور ان کے چہرے کا نور آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہے مگر مصنف نے بہت زیادہ زور اسی کے خلاف دیا ہے کہ انھوں نے مخبریاں کیں اور بے گناہوں کو پھانسیاں دلوائیں۔ چونکہ مجھے اس بیان کا یقین نہیں تھا اور ذاتی طور سے پورا اطمینان تھا کہ یہ واقعہ غلط ہے اس واسطے میں نے اس حصہ کو کتاب سے خارج کر دیا لیکن خارج کرنے سے پہلے ان کے پوتے سے جو ایک ریاست میں ایک بڑے عہدہ دار ہیں۔ کتاب کے مذکورہ اندراج کے متعلق خط لکھ کر حالات دریافت کئے۔ اور ان صاحب نے بھی میری رائے کی تصدیق کی۔ جس سے مجھے پورا اطمینان ہو گیا کہ مصنف کتاب نے یہ باتیں ذاتی اسباب کی بنا پر لکھدی ہوں گی۔

اس تذکرہ کے خارج کر دینے سے کتاب کے تسلسل بیان اور واقعات کی تفصیل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ میں نے ان اصلی مخبروں کے نام باقی رکھے ہیں جو درحقیقت مخبری کا کام کرتے تھے۔

مصنف نے جن صاحب کی مخبری پر بہت زور دیا ہے ان کے بارہ میں تحقیق سے ظاہر ہوا کہ وہ تو خود مشتبہ ہو کر برٹش افسروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے اور بعد میں ان کو رہائی دی گئی تھی۔ اگر یہ مخبری والی بات سچی ہوتی تو ان کو کوئی انعام دیا جاتا۔ نہ کہ ان کو گرفتار کیا جاتا۔

بس اس مختصر تمہید کے بعد اب ناظرین کو اصل کتاب پڑھنی چاہیئے اور یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ کتاب کے مصنف برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ تھے اس لئے انھوں نے بعض الفاظ اہل غدر کی نسبت ایسے استعمال کئے ہیں جو موجودہ زمانہ کے ہندوستانیوں کو غالباً ناگوار ہوں گے۔ مگر میں نے ان کی تبدیلی اپنے

فرائض سے باہر سمجھی۔ اس واسطے ان کو اصلی حالت پر قائم رہنے دیا۔

واقعات سچّے ہیں ایک شخص کی نسبت خلاف بیانی ظاہر ہونے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ باقی حالات بھی ایسے ہی بے اعتبار ہوں گے۔ کیونکہ مصنف نے اکثر حالات وہ لکھے ہیں جن کی تصدیق انگریزی تاریخوں اور خود میری لکھی ہوئی کتابوں سے ہوتی ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مصنف غلط نویس نہیں تھے۔ البتہ خاندانی اختلافات کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے ایک نامور اور معتبر بڑے آدمی کو بھی انھوں نے مخبر بنا دیا۔ جو مصنف کے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔

حسن نظامی دہلوی

۲۲ مئی سنہ ۱۹۳۰ء

کتاب کے آخر میں ان اشخاص کے حالات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جن کا مجمل ذکر مصنف کتاب نے کیا ہے اور جن کی تحقیقات میں نے بعد میں کی۔

جولائی سنہ ۱۹۳۰ء　　حسن نظامی

مؤلف کے ذاتی حالات اور کتاب لکھنے کی وجہ

میں غلام حسین خاں[۱] خلف نواب غلام حسن خان مؤلف کتاب ہذا لکھتا ہوں کہ لارڈ لیک صاحب بہادر نے میرے دادا نواب فیض اللہ بیگ خان کو ۱۸۰۳ء میں علاقہ میوات کے تمام محالات بندوبست کے واسطے سپرد کئے تھے۔ تین سال کے بعد ۱۸۰۵ء میں خدمت گزاری کے صلہ میں میرے دادا صاحب مرحوم کو پرگنہ ہتین تا عین حیات بطور استمراری عطا کیا گیا دادا صاحب کے انتقال کے بعد بموجب معاہدہ پرگنہ ہم سے نکال لیا گیا اور پس ماندگان کے واسطے ایک ہزار روپیہ پنشن مقرر کر دی گئی۔ میرے والد کو تین سو روپیہ علیحدہ ملتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد آگرہ کے لفٹنٹ گورنر بہادر نے ہماری خیر خواہی اور کثیر الاولادی اور خانہ بربادی پر رحم فرما کر جون ۱۸۵۵ء میں سو روپیہ پنشن میری مقرر کر دی ہم لوگ اپنی آبرو سنبھالے ہوئے اس پنشن میں گزر کرتے تھے۔ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو ہفتہ کے دن ایجنٹی میں ولایت سے حکم آیا کہ آٹھ سو روپے جو والد مرحوم کے انتقال کے بعد آٹھ ماہ تک مجھ کو نہیں ملے تھے

---

[۱] نواب میرزا خضر صاحب پنشنر تحصیل دار سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کے مصنف نواب غلام حسین خان نواب غلام حسن خان صاحب کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ کا نام سنگی تھا جو طوائف تھیں اور نواب غلام حسین خان صاحب نواب فیض اللہ بیگ خان صاحب کے بیٹے تھے۔ نواب فیض اللہ بیگ خان صاحب کے دوسرے پوتے نواب خضر صاحب ہیں۔ جو آجکل میرے ہاں درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں یا دالہی کرتے ہیں۔ نواب خضر صاحب عرصہ تک میوات میں تحصیلدار رہے۔ ان کے ایک بیٹے میرزا شاکر حسین صاحب متھرا میں بیرسٹری کرتے ہیں۔ اور ایک بیٹے فوج میں ایک بڑے عہدہ پر ہیں۔ ان کے دادا نواب میرزا فیض اللہ بیگ خان کا مزار میرے مکان ایمان خانہ کے شرق میں ہے جس کے سرہانے الہی سر محمد رفیق صاحب دفن ہوئے ہیں۔ حسن نظامی

دیدیئے جائیں ہفتہ کے دن ایجنٹی میں یہ حکم آیا دوسرے روز چونکہ اتوار تھا اور دفاتر وغیرہ بند تھے اس وجہ سے یہ حکم میرے پاس نہیں پہونچا امید تھی کہ کل دوشنبہ کے دن حکم ہمارے پاس پہنچ جاویگا اور وہ آٹھ سو روپے بھی ہم کو مل جائینگے کہ ایک دم تلنگوں کی فوج نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دوشنبہ کے دن دہلی پہونچکر بلوہ کردیا اور بلائے آسمانی کی طرح سب کو مصیبت میں مبتلا کردیا اور چار مہینہ چار دن لڑائی جھگڑے میں گزار دیئے آخر شرمندہ ہوکر یہ لوگ دہلی سے پورب کی طرف جہاں کے یہ نمک حرام رہنے والے تھے چلے گئے ان لوگوں نے راستہ میں سینکڑوں دیہات اور قصبات کو تباہ و برباد کردیا میرے خیال میں آیا کہ میں ایسے ہنگامہ کا حال لکھ کر اس کتاب کو جس کا نام "نصرت نامہ گورنمنٹ" ہے بطور یادگار چھوڑوں۔ اسواسطے میں نے یہ کتاب تیار کردی ؎

غدر کی ابتدا

۲۶ فروری ۱۸۵۷ء کو انیسویں رجمنٹ میں جو چھاؤنی برہم پور علاقہ مرشدآباد میں مقیم تھی اچانک کارتوس کاٹنے پر جھگڑا ہوا۔ سرکار انگریزی نے اس بنا پر رجمنٹ بر نجہ کے جمعدار اور ایک سپاہی کو پھانسی دے دی اور باقی رجمنٹ سے نافرمانی کے جرم میں ہتیار رکھوا لیئے اور اس کی تنخواہ دے کر اس کو برطرف کردیا۔ یہ لوگ رجمنٹ سے برطرف ہوکر اطراف و جوانب میں پھیل گئے اور جہاں جہاں تلنگوں کی فوج تھی وہاں پہونچکر سپاہیوں کو طعن و تشنیع سے فساد پر آمادہ کیا اور ان سب نے متفق ہوکر دہلی کا رخ کیا[1]

---

[1] غدر دہلی کے زمانہ میں باغیوں کو تلنگا۔ اور تلنگے کہا جاتا تھا۔ اور اسکی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ان کے افسر ملک تلنگانہ دکن کے باشندے ہونگے ورنہ باغی لوگ عموماً یوپی (ممالک اودھ و رہیلکھنڈ) کے رہنے والے تھے۔ اور ان کو پوربیہ بھی کہتے تھے۔ انگریزی فوج والوں کو خاکی کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی وردیاں خاکی رنگ کی تھیں ؎ حسن نظامی

سیاست دانوں کا خیال ہے کہ یہ تمام ہنگامہ اودھ کی بربادی کے باعث جو ان لوگوں کا وطن تھا ہوا۔ اس کے علاوہ جب گوروں کی فوج لکھنؤ کی تسخیر کیواسطے بھیجی گئی تو ان تلنگوں کو خبر نہیں کی گئی یہ بھی ایک بڑی وجہ ان کی بددلی اور شورش کی ہوسکتی ہے نیز یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس میں لکھنؤ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ کا بھی ہاتھ تھا کیونکہ یہ سب لوگ اودھ کے رہنے والے انہیں کی رعایا تھے لیکن بظاہر کارتوس کاٹنے کا قصہ مشہور کیا گیا ورنہ یہ کارتوس کا جھگڑا کوئی ایسا اہم قصہ نہ تھا کہ حکام اسکی وجہ سے ایسی سختی برتتے اور ایسی عمدہ فوج کو جو کروڑوں روپیہ صرف کر کے تیار کی گئی تھی اس طرح ایک معمولی سی بات پر ضائع کر دیتے چونکہ تلنگوں کی فوج میں زیادہ تر چھوٹی قوموں کے لوگ تھے اسوجہ سے ان سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں اگر اسی وقت گوروں کے ساتھ ان کو بھی شریک کر لیا جاتا تو غالبًا یہ صورت پیش نہ آتی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب اکثر لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے تو پھر باقی جو اس خیال کے نہیں تھے وہ بھی اوروں کی دیکھا دیکھی چاروناچار بغاوت میں شریک ہو گئے[1]۔ الغرض جب تمام فوج جہاں جہاں چھاؤنی میں متعین تھی فساد پر آمادہ ہوگئی تو سب سے پہلے میرٹھ کی چھاؤنی کی فوج نے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو فساد شروع کیا۔ فساد کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ فساد سے ایک دن پہلے کرنیل نے اپنے سواروں کو کارتوس کاٹنے کا حکم دیا۔ سواروں نے انکار کیا۔ حکم عدولی کے جرم میں چودہ چودہ برس کی قید کی سزا ان سواروں کو دی گئی۔ دوسرے لوگوں کو خیال ہوا کہ آج ان کو جیل بھیجا گیا ہے کل کو یہی دن ہمارے لیئے رکھا ہے اس وجہ سے

---

[1] مصنف نے غدر کے جو اسباب لکھے ہیں وہ یک طرفہ اور ناقص ہیں۔ سر سید احمد خان صاحب نے ،، اسباب بغاوت ہند،، کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اسمیں انگریزوں کی بعض غلطیوں کو غدر کا باعث قرار دیا تھا۔ یہ کتاب ڈپوٹی کتاب علی گڈھ سے مل سکتی ہے ۔ حسن نظامی

تلنگوں کی ما پلٹ پلٹن کو ملالیا اور غدر کر دیا جب بلوہ شروع ہو گیا تو پھر شہر کے لوگ بھی اس میں شریک ہو گئے مگر پھر شہر والے باغیوں سے علیحدہ ہو گئے اور باغیوں نے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا اور کوٹھیوں اور بنگلوں میں آگ لگانی شروع کر دی میرٹھ کی اس کارروائی کے بعد یہ لوگ اسی رات کو دہلی کی طرف روانہ ہو گئے اور ۱۱ مئی کی صبح کو ایک آفت ناگہانی کی طرح قلعہ دہلی کے جھروکہ کے نیچے پہنچکر راجگھاٹ دروازہ سے شہر میں داخل ہو گئے۔ حکام کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو سب اس ہنگامہ کو روکنے کا کام کرنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے انگریزوں نے اس فساد کے واقعات کی اطلاع بذریعہ خط دہلی کے کمشنر سیمین صاحب بہادر کو کر دی تھی اور خط بلوائیوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے کمشنر صاحب بہادر کے پاس آدھی رات کو پہونچ گیا تھا لیکن کمشنر صاحب نے وہ خط بغیر پڑھے ہوئے اپنی جیب میں ڈال لیا اور کسی کو خبر نہیں کی ورنہ وہی وقت انتظام کا اچھا تھا۔ اگر ان لوگوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی انتظام کر لیا جاتا تو یہ تباہی و بربادی پیدا نہ ہوتی مگر مجھ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کیونکہ اول تو اتنے بڑے ہنگامہ کی خبر میرٹھ سے بذریعہ تار کمشنر صاحب کو دی جاتی اور اگر چھٹی خلاف وقت ہی پہونچی تھی پھر بھی ایک ذمہ دار افسر سے یہ بعید ہے کہ وہ اتنے بڑے ہنگامہ کی خبر پا کر چپ چاپ بیٹھا رہے اور کوئی انتظام نہ کرے اس کے علاوہ جنرل ہیوٹ صاحب جو میرٹھ کے کیمپ میں تھے ان کی بھی تحریر میں کہیں اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ کوئی خط وہاں سے بھیجا گیا تھا ۵۴

۵۴ میرٹھ کی چھٹی کی مفصل بحث میں نے تاریخ غدر دہلی کے آٹھویں حصہ،، دہلی کی جانکنی، میں لکھ دی ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں خط پڑھا۔ بعض کہتے ہیں شراب کے نشہ کے سبب نہیں پڑھا۔ حسن نظامی ؞

بلوائی میرٹھ سے آٹھ بجے دن کے فرار ہوکر دریائے جمنا کے پل سے اس پار چوکی پر حملہ آور ہوئے۔ داروغہ پل نے اس واقعہ کی اطلاع اسی وقت النسین صاحب بہادر مجسٹریٹ کو دی صاحب موصوف اسی وقت ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے پل پر تشریف لے گئے جناب سیمن فریزر صاحب اس وقت گرجا میں نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے جب ان کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی موقع پر پہونچ گئے اور بلوائیوں کو سمجھانا چاہا لیکن ان کی فہمایش کا کوئی اثر ان پر نہ ہوا۔ بروقت صاحب موصوف کو یہ تدبیر سوجھ گئی کہ انھوں نے کشتیوں کا پل توڑ دیا اور کشتیاں ہٹالیں یہ تدبیر کارگر ہوئی اور بلوائیوں کا داخلہ رک گیا۔ صاحب موصوف اسی انتظام میں مشغول تھے کہ کچھ لوگ جس طرف سے دریا پایاب تھا شہر میں داخل ہوگئے اور بلا اس امتیاز کے کہ سوداگروں کی کوٹھیاں ہیں یا انگریزوں کی ہیں آگ لگانی شروع کردی اور لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہونچانے لگے۔ ان کا سب سے پہلا مقابلہ سیمن صاحب بہادر کمشنر ڈگلس صاحب بہادر سکریٹری اور ایچ النسین صاحب بہادر مجسٹریٹ سے ہوا جبکہ یہ تینوں متفقہ طور پر شہر کے انتظام میں مصروف تھے۔ جن میں سے دو اول الذکر پادری صاحب کے ساتھ میگزین میں جارہے تھے کہ مرزا جوان بخت کے اردلی مسمی مغل اور اللہ داد خان ولایتی خاصہ بردار نے زینہ میں ان کو قتل کردیا اور اوپر جاکر پادری صاحب کی دونوں لڑکیوں کو بھی مار ڈالا۔ یہ بھی روایت ہے کہ کمشنر صاحب بہادر نے ایک فیر طمنچہ کا ایک ترک سوار پر کیا تھا جس سے وہ ہلاک ہوگیا تھا بس پھر کیا تھا یہ لوگ پل پڑے اور تینوں انگریزوں کا تلوار سے کام تمام کردیا۔ اور بلا امتیاز ولایتی اور کرانی عورتوں اور بچوں کو بھی تلوار کے گھاٹ اتارنا شروع کردیا ؁

؁ اس قتل و ہنگامہ کی پوری تفصیل میری کتاب "تاریخ غدر دہلی کے چوتھے حصہ بہادر شاہ کا مقدمہ" اور پانچویں حصہ میں درج ہے۔ حسن نظامی

جب اس واقعہ کی اطلاع چارلس لباس صاحب بہادر جج دہلی اور مرفے صاحب بہادر کلکٹر پرمٹ کو پہونچی تو یہ لوگ کشمیری دروازہ کے نیم گارد کے موقعہ پر پہونچکر ٹھیرے کہ اس اثنا میں تلنگوں کی پلٹن مع افسروں کے مسلح ہوکر نیم گارد پر پہنچی اس وقت کرنل صاحب پلٹن نے پلٹن کے سپاہیوں سے نرمی اور چاپلوسی سے کہا کہ یہ وقت سرکار کی خیر خواہی کا ہے اور یہی وقت ہے کہ حق نمک ادا کرتے ہوئے دل وجان سے سرکار کی مدد کی جائے تاکہ اس کے صلہ میں انعام واکرام کے مستحق ہوجاؤ۔ پلٹن کے سپاہیوں نے وفاداری کا پختہ عہد کیا اور قسم کھائی کہ ہم سب سرکار کے خیر خواہ رہیں گے ہر چند کہ کرنیل صاحب کو ان کی اس قسم کا اعتبار نہیں تھا لیکن کرتے بھی تو کیا کرتے مجبوراً بذات خود سوار ہوکر مارچ کا حکم پلٹن کو دیا جب صاحب موصوف گرجا کے قریب پہونچے تو چند سواروں نے بندوق کے فائر کئے جس سے ایک ہرکارہ سازخم پلٹن کے اجیٹن کے آیا صاحب موصوف نے فیر کا فوراً حکم دیا لیکن پلٹن والوں نے فیر کرنے سے انکار کردیا یہ حالت دیکھ کر پلٹن کے انگریز باڈی پر چلے آئے اور لباس صاحب اور مرفے صاحب نیز دیگر انگریز بھی باڈی پر پہونچ گئے اسی درمیان میں الگزنڈر پلٹن تیار ہوکر باڈی پہونچگئی فوج کے افسروں نے باوجود اس قدر شورش دیکھنے کے پھر بھی تین گھنٹہ مستقل طور پر فہمائش کی لیکن جب ان کو یقین ہوگیا کہ ان لوگوں کے دلوں پر سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوگا تو مجبور ہوکر کرنال۔ پانی پت۔ شملہ وغیرہ کی طرف روانہ ہوگئے اور منزل مقصود پر پہونچکر انتقام اور سزادہی کی تدابیر کرنے لگے۔ انہیں لوگوں میں سے جان مٹکاف صاحب جنٹ مجسٹریٹ دہلی بلوہ کے دن تنہا گھوڑے پر سوار ہاتھ میں ننگی تلوار لئے شہر سے باہر نکلے اور ان ظالموں سے بچتے بچاتے پہاڑ گنج کے تھانہ میں پہونچے۔ مرزا امین الدین خان کے نانے وارث نے صاحب موصوف کو کپڑے بدلوا کر

اور تبدیل ہیئت کرکے بہنورا نمبردار گلابی باغ کے پاس پہونچا دیا نمبردار مذکور نے صاحب موصوف کو پہلے تو درگاہ حضرت سید حسن رسول نما رضہ میں پہونچایا اور پھر پوشیدہ طور پر ایک محفوظ جگہ میں رکھا اور صاحب کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا۔ پھر چند دن کے بعد صاحب موصوف کو جھجر پہونچا دیا لیکن والی جھجر نے تلنگوں کے خوف سے صاحب موصوف کو اپنے ہاں پناہ نہیں دی بلکہ ملاقات بھی نہیں کی ایک بیان یہ بھی ہے کہ ملاقات تو کی لیکن جیسا کہ چاہیئے تھا اخلاق و مروت سے کام نہیں لیا بلکہ جھجر میں ٹھیرنے بھی نہیں دیا۔ مٹکاف صاحب نے جب یہ سرد مہری اور بے اعتنائی دیکھی تو وہ وہاں سے رنجیدہ ہو کر چلے گئے۔ عجب زمانہ ہے کہ رئیس جھجر کو یہ ریاست سر سا فلس مٹکاف صاحب بہادر کی کوشش سے ملی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے محسن کے بیٹے کے ساتھ یہ سلوک کیا آخر اس کا نتیجہ بھگتا۔

اب تلنگوں کا حال سنیئے۔ تلنگوں کے ساتھ سینکڑوں چمار اور دھنیئے جلاہے مفلس قلاش ہو گئے اور ان سب نے مل کر تمام کوٹھیوں بنک خزانہ اور تمام دفاتر اور کچہری کمشنری و فوجداری اور کچہری صدر الصدور و منصفی وغیرہ کو آگ لگا دی اور تمام نقد و جنس جو کچھ ہاتھ لگا لے گئے۔ اور کاغذات مالی اور ملکی سب پھاڑ ڈالے دوسرا کام یہ کیا کہ شیشے کی لال ٹینیں جو سڑکوں پر لگی ہوئی تھیں توڑ پھوڑ کر پھینک دیں اور ان کی لکڑیاں زمین سے اکھاڑ کر تمام شہر کو روشنی سے محروم کر دیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ان لوگوں نے تمام شہر اور قلعہ کو گھیر لیا اور میگزینوں پر اور قلعہ کے دروازوں پر قبضہ کرکے ہر جگہ اپنا چوکی پہرہ لگا دیا جب میگزین پر تلنگوں نے قبضہ کیا تو اس وقت ایک عجیب حادثہ پیش آیا چند انگریز میگزین کے ایک برج میں تھے جس میں بارود کے پیپے بھرے ہوئے تھے وہ میگزین اڑ گیا اور ایک ایسی ہیبت ناک آواز ہوئی کہ تمام مکانات شہر کے ہل گئے اور لوگوں کے دل کانپ گئے۔ میگزین کے اڑنے سے پتھر وغیرہ ایسے اڑے کہ اسکے صدمہ سے

تقریباً چھ سو آدمی ہلاک ہوگئے۔ جب رات ہوئی تو تلنگوں کی اور دو پلٹنیں جو وزیر آباد کی چھاؤنی میں متعین تھیں دہلی میں داخل ہوئیں ان کی سلامی میں گیارہ توپیں چلائی گئیں اور یہ سب مل کر ایک ہوگئے اور پھر سب نے مل کر دروازوں اور قلعہ کی نگرانی اور اطراف و جوانب کی نگہبانی وغیرہ کا بندوبست شروع کیا اسی رات شہر کے بدمعاشوں نے چند نقلی تلنگوں کو ساتھ لے کر شہر کو لوٹنا شروع کر دیا اور ساہوکاروں وغیرہ کا مال و اسباب ظلم سے لوٹ لیا اور پھر لوٹ کے بعد مخبری کا پیشہ اختیار کر لیا۔

الغرض جب صبح ہوئی تو تلنگوں کے کہنے سے بادشاہ کی سواری مع شاہزادوں کے چاندنی چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ پر پہونچی بادشاہ نے فوج سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں جان و مال سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن نہ میرے پاس خزانہ ہے نہ فوج نہ ملک البتہ جب میرا ملک مجھ کو مل جائے گا تو میں تم کو بھی عنایات خسروانہ سے سرفراز کروں گا۔ ان لوگوں نے عرض کی کہ نہ ہم مال کے خواہاں ہیں نہ فوج چاہتے ہیں ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ بندگان عالی ہماری سرپرستی فرمائیں ہم لوگ اپنا سر حضور کے قدموں پر نثار کرنے کے واسطے تیار ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان میں حضور کی سلطنت قائم کر کے ابدی نیک نامی حاصل کریں بادشاہ نے جواب میں فرمایا تم جو کچھ کہتے ہو میری بھی دلی آرزو یہی ہے جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہارے واسطے موجود ہے اسکو کھاؤ پیو اور ہمت کر کے مخالفوں کو نکال دو اور میرا سکہ جاری کر دو۔ قریب شام بادشاہ کی واپسی قلعہ میں ہوئی قلعہ میں پہنچکر بادشاہ نے ارکان دولت سے مشورہ کیا ہر شخص نے اپنے حوصلہ اور عقل کے مناسب بمقتضائے وقت رائے دی آخر اسی صلاح و مشورے میں صبح ہوگئی۔

صبح کو بادشاہ نے دیوان خاص میں دربار کیا اور باغی فوج کے تمام افسران

دربار میں حاضر ہوئے اور انتظام ملکی اور سامان جنگ و رسد وغیرہ کے واسطے عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا میرے جتنے نوکر چاکر ہیں سب تمہارے ہیں تم سب ملکر جس طرح مناسب وقت سمجھو عمل کرو۔ بظاہر تو لوگ بہت کچھ شیخیاں بگھارتے تھے لیکن حقیقتاً انجام کے خوف سے ہر شخص پریشان تھا اور سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

شام کے قریب باغی لوگ ساٹھ انگریز عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لائے اور قیدیوں کی طرح بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا سخت گناہ ہے۔ ان کو قلعہ کے جیل خانہ میں نہایت آرام سے رکھا جائے اور ان کے کھانے پینے کی پورے طور پر خبر گیری کی جائے یہ لوگ ایک شبانہ روز قید میں رہے تیسرے روز تلنگوں نے ان قیدیوں کو قتل کرنے کے واسطے طلب کیا۔ بادشاہ نے ہر چند ان کے قتل سے روکا۔ لیکن ان سنگ دلوں نے ایک نہ سنی اور ان سب کو جیل خانہ سے نکال کر قلعہ کے نقار خانہ کے نیچے کھڑا کر کے گولیوں اور تلواروں سے قتل کر دیا اور ذرا بھی خوف خدا انہیں کیا لوگ ان کی اس شقاوت قلبی اور بے رحمی سے سخت متنفر ہو گئے اور گالیاں دیتے تھے اس روز سے ان کم بختوں نے یہ ظلم اختیار کیا کہ جس کے گھر میں چاہتے تھے۔ گھس پڑتے تھے اور بہانہ یہ کرتے تھے کہ تمہارے گھر میں انگریز چھپے ہوئے ہیں۔ اس بہانہ سے لوگوں کے گھروں میں گھس کر تمام مال و اسباب لوٹ لاتے تھے۔

چنانچہ اسی طرح مئی کی ۱۳ تاریخ کو یہ باغی منشی موہن لال صاحب عرف آغا حسن[1] جان صاحب کے قتل کرنے کو جو سرکار انگریزی کے قدیم خیر خواہ ہیں

[1] ان کے حالات کی پوری تفصیل معلوم نہیں ہوئی ممکن ہے اس کتاب کے آخر میں پورے حالات درج ہو سکیں کیونکہ میں نے متعدد واقف کار حضرات کو لکھا ہے۔ ان کے جوابات ابھی نہیں آئے۔ اور کتاب لکھنے کو دے دی ہے۔ حسن نظامی

ان کے گھر میں گھس گئے اور ان کو پکڑ لائے اور چاہتے تھے کہ ان کو قتل کر دیں کہ تمام محلہ والے جمع ہو گئے اور ان کو اس حرکت سے روکا اور آخر تمام گھر کا مال و اسباب جان کا صدقہ مال سمجھ کر لے گئے اور منشی صاحب کی جان بچ گئی۔

اسی طرح یہ لوگ ڈپٹی رام سرنداس مرحوم کے مکان میں گھسے اور ان کا جتنا مال و اسباب تھا سب لوٹ لیا اور ڈپٹی صاحب کے بھائی ناظر گوبند سرن صاحب کے قتل پر آمادہ ہوئے۔ بچارے ناظر صاحب جان کے خوف سے چھپ گئے آخر میاں نظام الدین صاحب خلف میاں کلے صاحب نے جو بادشاہ کے پیر تھے اور ناظر صاحب سے قدیمی اتحاد رکھتے تھے اور ہم عمر و ہم وطن بھی تھے کوشش کر کے ناظر صاحب کی جان بچائی اور جو کچھ اسباب و زیور باقی تھا اسکو زمین میں گاڑ دیا لیکن ڈپٹی صاحب کے نمک حرام کہار ملازموں نے اسکو ہر جگہ سے نکال لیا اور ناظر صاحب بچارے کے اور ان کے متعلقین کے پاس سوائے ان کپڑوں کے جو جسم پر تھے کچھ باقی نہ رہا۔ ناظر صاحب نے بڑی سختی اور تنگی سے یہ مصیبت کے دن بسر کئے جب انگریزوں کی عملداری ہوئی تو یہ بچارے پہاڑ گنج کے تھانہ دار کر دیئے گئے انھوں نے اس علاقہ کا بہت اچھا انتظام کیا اور سینکڑوں مجرموں کو گرفتار کیا ان کے حسن انتظام سے سب حکام خوش اور راضی رہے۔

عقلمند اور دور اندیش لوگ مصلحت وقت دیکھ کر جو کام بھی کرتے ہیں وہ حکمت اور تدبیر سے خالی نہیں ہوتا ایسے لوگوں میں سے حکیم احسن اللہ خان اور بادشاہ کی خاص بیگم نواب زینت محل بیگم صاحبہ بھی ہیں انھوں نے شاہی شقہ کے ذریعہ اس ہنگامہ کی خبر لفٹننٹ گورنر آگرہ کو پہونچائی اور خفیہ طور پر خط و کتابت لفٹننٹ گورنر سے جاری رہی۔ اس شاہی خط کے جواب میں لفٹننٹ گورنر نے اس

مضمون کا خط لکھا کہ۔ ہم کو ان حالات کے سننے سے سخت رنج اور افسوس ہوا
آپ اطمینان رکھیں ہم امید کرتے ہیں کہ عنقریب فساد کا انسداد ہو جائے گا۔
لیکن چند روز کے بعد لفٹنٹ گورنر کو یہ معلوم ہوا کہ باغیوں کے ساتھ بادشاہ بھی
سازباز رکھتے ہیں تو لفٹنٹ گورنر بہت برہم ہوئے اور بادشاہ کو ایک خط بہت سی
شکایتوں کا تہدید آمیز لکھا بادشاہ نے بھی اس خط کا مناسب طریقہ سے جواب
دیا چونکہ یہ سب معاملات خفیہ تھے اور یہ خط و کتابت بالکل پوشیدہ طور پر ہوئی تھی
اس وجہ سے اس کے متعلق کوئی کافی معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ ہاں خیال
یہی ہے کہ ضرور لفٹنٹ گورنر بادشاہ کی ان حرکات سے جو انھوں نے کوتاہ اندیشی
سے کیں اور باغیوں کے ساتھ سازباز رکھنے پر برہم ہوئے اور بادشاہ کے دوسرے
خط کا جواب بھی خاطرخواہ نہ ملا ہوگا۔[1] افسوس اس کا ہے کہ اگر عمائدین شہر
اور بڑے بڑے لوگ متفق ہو کر اس بلوہ کا انتظام کرتے تو یہ صورت پیش نہ
آتی اور اس طرح لوگوں کی خانہ بربادی نہ ہوتی اور بادشاہ پر بھی کوئی الزام نہ آتا
اب بادشاہ اور رعایا دونوں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ جس وقت
بلوائیوں کی فوجیں آئی ہیں ان سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لیتے اور درگاہ
حضرت خواجہ قطب الدین صاحب رض میں یا کسی اور جگہ چلے جاتے اور باغی
فوج کو صاف جواب دے دیتے اور ان سے کوئی سروکار نہ رکھتے تو یہ بات
کچھ دشوار نہ تھی لیکن افسوس اور صد افسوس بادشاہ کی اور ان گمراہوں کی
عقل پر کہ ایسے انصاف پرور حاکموں کے ساتھ جو بادشاہ کو ایک لاکھ روپیہ

---

[1] مصنف کتاب نے ملکہ زینت محل اور حکیم احسن اللہ خان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ دہلی کی افواہوں کی بنا پر لکھا ہے ورنہ میری تحقیقات یہ ہے کہ ملکہ صاحبہ اور حکیم صاحب دونوں بے قصور تھے نہ انھوں نے کسی سے مخبری کی نہ بغاوت کی حمایت کی ۔ حسن نظامی

ماہانہ دیتے تھے اور ہر قسم کے آداب شاہانہ بجا لاتے تھے۔ نیز لاکھوں روپے عمائدین اور ساکنان شہر کو بلا کسی خدمت کے دیتے تھے بغاوت کی اور یہ نہیں سمجھا کہ اس عملداری کے سوا جس کو خدا قیامت تک قائم رکھے دوسری عملداری میں سوائے تباہی اور رسوائی کے کیا ہوگا۔[1]

بادشاہ بوڑھے ہو چکے تھے اور عمر طبعی کو پہونچ گئے تھے ان کے لئے زیبا نہ تھا کہ وہ اپنی جان کا اس قدر خوف کرتے اور دور اندیشی سے کام نہ لیتے۔

سرکار کمپنی بہادر کہ قدیمی محسن تھی اس کا خیال بالکل دل سے بھلا دینا اور منافقوں کے ساتھ ہمہ تن شریک ہو جانا بالکل عقل و دانش کے خلاف تھا میں تسلیم کرتا ہوں کہ باغیوں کی سپاہ بادشاہ کو قید کر لیتی یا قتل کر دیتی لیکن اس صورت میں تیموری سلطنت کا نام ہمیشہ قائم رہتا اور سرکار انگریزی بادشاہ اور رعایا کے ساتھ ایسی پرورش کرتی کہ باید و شاید۔ لیکن مقدرات نہیں بدلتے۔ تقدیر الٰہی یوں ہی تھی کہ ہر شخص خام خیالی اور نافہمی کے باعث اس پر متفق تھا کہ انگریزی عملداری یک قلم صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی کیونکہ سرکار انگریزی کی ڈاک سب طرف بند ہو گئی لوگوں کی یہ بھی بہت مضبوط دلیل تھی کہ چونکہ سلطنت جنگی فوج اور خزانے اور سامان جنگ پر منحصر ہے اور یہ سب چیزیں باغیوں کے ہاتھ میں ہیں تو سلطنت کس طرح رہ سکتی ہے مجھ کو تو حیرت ہے کہ ان لوگوں کی عقل کو کیا ہو گیا تھا کہ تھوڑی سی باغی فوج کے آجانے سے ایسا ظاہری اور باطنی اطمینان حاصل ہو گیا کہ بہت سے سرکاری ملازمین اور وظیفہ خواروں نے سینکڑوں التجاؤں سے عہدہ داری کے لئے استدعا کی اور بادشاہی

---

[1] مصنف کتاب ہذا کی اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسباب بغاوت ہند سے یا تو اچھی طرح واقف نہ تھے اور یا انھوں نے انکو لکھنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور یا وہ اس کتاب میں اس قسم کے خیالات ظاہر کر کے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔۔۔ حسن نظامی

اہلکاروں کی خوشامد کر کے فوج روسیاہ میں عہدوں پر مامور ہو گئے اور اپنے آقاؤں کے ساتھ لڑائی کی ٹھان لی۔

ملک کا انتظام تو فوج کی اطاعت اور بادشاہ کی سیاست دانی پر ہے۔ اور جس جگہ نہ فوج مطیع ہو نہ حاکم سیاست داں وہاں کا انتظام کیا ہو سکتا ہے اس کا انجام بدعملی ہی ہو گا۔

لوگوں کے بدخواہ اور دشمن جاسوسوں اور مخبروں نے حکیم صاحب اور بیگم صاحب کی انگریزوں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کا حال باغی فوج سے بیان کر دیا جب ان جاہلوں کو یہ راز معلوم ہو گیا تو یہ لوگ حکیم صاحب کے قتل کے درپے ہو گئے۔ حکیم صاحب ایک بڑے صاحب عقل و فراست آدمی ہیں انھوں نے سمجھ لیا کہ باغی لوگ میرے درپے آزار ہو گئے ہیں اس لئے پہلے تو انھوں نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ میرا انگریزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے بعد کارخانجات اور فراہمی رسد وغیرہ کا انتظام جو ان کے متعلق تھا مرشد زادوں کے سپرد کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ (شہزادوں کو مرشد زادہ کہتے تھے)

دہلی سے انگریزوں کے جانے کے بعد

چوتھے دن فوج اور ارکان دولت کی استدعا پر شاہی پروانے رئیس جھجر۔ بہادر گڈھ راجہ بلب گڈھ اور نواب دوجانہ و فرخ نگر راجہ بجے پور والور و گوالیار و بیجا بائی اور اور رئوسا کے نام شتر سواروں کے ہاتھ روانہ کئے گئے کہ وہ حاضر ہو کر بادشاہی فوج کی مدد کریں اور بذریعہ چوبداروں کے جملہ عمائدین و ساکنان شہر کو تاکیدی حکم دیا گیا کہ وہ روزانہ صبح و شام شاہی دربار

میں حاضر ہوا کریں۔ شہر کے لوگ تلنگوں کے خوف اور اپنی جان و مال کے ڈر سے
شاہی حکم کی تعمیل کرتے تھے اور صبح شام دربار میں حاضر ہوتے تھے لیکن نواب
امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان فخر الدولہ نواب احمد بخش خان مرحوم
جاگیر دار پرگنہ لوہارو کے بیٹے جو بڑے عقل مند اور سمجھ دار اور وظیفہ خوار سرکار کمپنی
بہادر کے ہیں کبھی خوشی سے لال قلعہ میں نہیں گئے۔ اگر بادشاہ چار مرتبہ بلاتے
تھے تو یہ ایک مرتبہ جبراً قہراً حاضر ہوتے تھے بلکہ چند بار بادشاہ نے ان کی
لیاقت اور کاردانی کی بنا پر فوج کے بندوبست اور انتظام ملک کے واسطے
اپنی زبان سے فرمایا لیکن ان لوگوں نے عاجزی اور انکساری سے عذر کر کے انکار
کر دیا اور کئی مرتبہ اپنے پرگنہ کو جانے کی اجازت چاہی اور روانگی کے ارادہ سے
اپنے بال بچوں کو لے کر شہر کے دروازہ تک گئے لیکن باوجود انتہائی منت و
سماجت کے باغیوں کی فوج نے جو دروازہ پر تعینات تھی جانے نہ دیا بلکہ گالیاں
دیں آخر مجبور ہو کر اپنے گھر کو لوٹ آئے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مرزا مغل اور افسران
فوج نے نواب صاحب سے بزور حکومت روپیہ طلب کیا لیکن نواب صاحب نے
کبھی ایک کوڑی نہیں دی اور امروز فردا ہی کرتے رہے حتیٰ کہ ایک دن نوبت
فساد اور کشت و خون کی پہونچ گئی یعنی نواب امین الدین احمد خان معہ اپنے
چھوٹے بھائی اور چند ملازموں کے حسب الطلب مرزا مغل کے دربار میں گئے
ان کے پہونچتے ہی مرزا مغل نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ روپیہ کیوں
نہیں دیتے ہیں نواب صاحب نے جواب میں کہا کہ چیل کے گھونسلے میں ماس
کہاں۔ میں تو سپاہی ہوں میرے پاس سوائے چند طمنچوں اور تلواروں اور
ہاتھی گھوڑوں اونٹوں اور املاک اور فرش اور کپڑوں کے کیا رکھا ہے آمدنی
سے زیادہ میرا خرچ ہے قرضدار ہوں میرا پرگنہ سرکش ہے اور یک فصلہ ہے

میرے بال بچوں کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیجئے اور میرا سب سامان ہاتھی گھوڑے اونٹ وغیرہ لے کر اپنے خرچ میں لائے اور مجھ کو رخصت دیجئے کہ میں اپنے پرگنہ پر جا کر اپنی اوقات بسری کی فکر کروں۔ دربار میں چند افسر تلنگوں کے بیٹھے تھے ان میں سے ایک افسر نے جو نہایت جاہل تھا کھڑے ہو کر مرزا مغل سے عرض کیا کہ اگر ہم کو حکم ہو تو ایک گھنٹہ میں نواب صاحب سے روپیہ لے لیں۔

نواب صاحب ہمیشہ کے مغلوب الغضب آدمی ہیں ان کو اس بات کی برداشت کہاں تھی اسکی یہ بات سنتے ہی بولے کہ تجھ پر طلاق ہے اور تجھ کو کھانا پینا حرام ہے جو مجھ سے روپیہ نہ لے لے اور میرے گھر نہ آئے اور روپیہ نہ لے تیری کیا حقیقت ہے کہ مجھسے روپیہ لیگا جب نوبت یہاں تک پہونچی تو مرزا مغل نے مناسب سمجھ کر دربار برخاست کر دیا اور محل میں چلے گئے نواب صاحب وہاں سے اٹھ کر بادشاہ کے پاس گئے اور اس گفتگو کو دہرایا بادشاہ نے مرزا مغل کو حکم بھیجا کہ فوج نواب صاحب سے روپیہ طلب نہ کرے۔ نواب صاحب وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلے آئے اور نواب صاحب اور جان مٹکاف صاحب سے پہاڑی پر خط وکتابت جاری رہی اور ان کا انجام اچھا رہا۔ جب انگریزی لشکر فاتحانہ طور پر دہلی میں داخل ہوا تو اسوقت نواب صاحب موصوف معہ اپنے بھائی اور دیگر متعلقین کے اپنا تمام سامان ہاتھی گھوڑے وغیرہ لے کر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں مقیم تھے جب انگریزی فوج وہاں پہونچی تو اس نے نواب صاحب کے ہاتھی گھوڑے وغیرہ لے لئے اس کے بعد تمام اسباب نقد وجنس اور کپڑے وغیرہ بھی لے گئے نواب صاحب بیچارے انگریزی فوج والوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو کر معہ اپنے متعلقین کے فرخ نگر چلے گئے۔

دو دن وہاں قیام کر کے ریاست دوجانہ پہنچے اور وہاں سامان ضروری درست کر کے

کمشنر صاحب کی طلبی پر دہلی کے قلعہ میں آئے کمشنر صاحب کے ملاقات کے بعد ان کے حکم سے ایک مکان قلعہ میں پسند کر کے اس میں سکونت پذیر ہوئے چار مہینہ تک نواب صاحب قلعہ میں رہے۔ جب روبکاری کے بعد سرکار انگریزی سے ان کی صفائی ہوگئی تو کمشنر صاحب کے فرمانے کے بموجب قلعہ کے باہر پنچکی کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے کر اس میں رہنے لگے اور ان کے مقدمہ کی رپورٹ جاگیر واملاک کی واگزاشت کے واسطے صدر میں بھیجی گئی پھر اگست ۱۸۵۸ء میں بموجب حکم گورنمنٹ پرگنہ لوہاروان کو واپس دیا گیا اور وہ یعنی نواب احمد الدین خان معہ اپنے بھائی کے اپنے علاقہ کے بندوبست کے واسطے چلے گئے۔

بادشاہی شقوں کے جواب میں سرداروں اور جاگیرداروں کی عرضیاں اطراف وجوانب سے بدیں مضمون موصول ہوئیں کہ ہم بوجہ بدامنی اور بدانتظامی کے اپنے علاقہ سے غیر حاضر نہیں ہوسکتے۔ البتہ جب یہ ہنگامہ فتنہ وفساد فرو ہوجائے گا اس وقت حاضر ہوں گے۔ یہ سب عرضیاں بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئیں اور اکثر وہ لوگ جو شاہی شقے لے کر گئے تھے راستہ ہی میں قزاقوں اور ٹھگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے۔

بہادر شاہ کا دربار

صبح کو بادشاہ دیوان خاص میں چاندی کی کرسی پر جلوہ فرما ہوئے۔ درباری اہلکار و مرشد زادے اور امرائے نامدار او عمائدین شہر اپنے اپنے قرینے سے کھڑے ہوئے۔ مرزا ظہیر الدین عرف مرزا مغل[1] خلعت فاخرہ اور خطاب سپہ سالاری سے سرفراز کئے گئے۔

[1] میرزا مغل بہادر شاہ کے بیٹے تھے۔ غدر کے زمانہ میں سپہ سالار بنائے گئے اور غدر کے بعد انگریزی افسر مسٹر ہڈسن کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حسن نظامی

اور مرزا ابوبکر مرزا فخرو مرحوم کے بیٹے کو باغیوں کے کل سواروں کی افسری دی گئی مرزا خضر سلطان کو پلٹن ہاپٹ کی کرنیلی دی گئی اور محمد بختاور شاہ الگزنڈرا پلٹن کے کرنیل مقرر ہوئے۔ مرزا عبداللہ کو پلٹن بیلی کی افسری ملی۔ اور مرزا قویاش پلٹن کے کرنیل مقرر ہوئے اور مرزا عبداللہ پسر مرزا شاہرخ مرحوم کو پلٹن جالیسر کی کرنیلی مرحمت ہوئی۔ اور زینت محل صاحبہ نے بلم ٹیر پلٹن کو اپنی ماتحتی میں لیا۔ اور مرزا مینڈھو پلٹن کین کی افسری پر متعین ہوئے۔ اور نواب محمد حسن خان مرزا خضر سلطان کے نائب ہوئے اور مرزا معین الدین حسن صاحب مرزا مغل کی نیابت میں مقرر ہوئے۔ اور میر نواب مرزا قویاش کے نائب ہوئے اور میر نواب پسر میر تفضل حسین وکیل سررشتہ ہوئے اور میر فتح علی وزیر صحرائی یہ دونوں آدمی گوڑگانواں اور گڑھی ہرسرو کی طرف خزانہ لانے کے واسطے روانہ ہوئے اور یہ دونوں آدمی قریب چالیس ہزار روپیہ کے دونوں جگہ سے لائے اور اس خیر خواہی کی بنا پر سپہ سالار کی بارگاہ کے قصر میں داخل ہوگئے۔

اور شاہزادہ محمد عظیم بن شہزادہ جہاں اختر کہ پہلے عہدہ اسسٹنٹ پرمٹ پر بمقام سرسہ سرکار انگریزی کی طرف سے مقرر تھے اب بحکم بادشاہ دہلی ضلع سرسہ کے بندوبست اور وہاں سے خزانہ لانے کے واسطے ایک پلٹن اور دو ضرب توپ اور میگزین وغیرہ لے کر سرسہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے ناکام واپس آئے۔ اثناء راہ میں انگریزی فوج سے مقابلہ بھی ہوا لیکن سوائے پسپائی کے ان سے اور کچھ نہ ہوا۔

دوسرے دن مرزا جواں بخت[۱] وزارت کے عہدہ پر سرفراز کئے گئے۔ اور

---

[۱] میرزا جواں بخت بہادر شاہ کے لاڈلے بیٹے تھے۔ ملکہ زینت محل ان کی والدہ تھیں۔ حسن نظامی

نواب ولیداد خان رئیس مالاگڈھ تعلقہ دار ضلع بلند شہر جو بادشاہ دہلی کے قریبی رشتہ دار تھے خلعت اور نظامت صوبہ دوآبہ سے مشرف ہوئے اور راؤ صاحب پرگنہ دادری اور رد ہوم کو بادشاہ کی جانب سے خلعت اور خطاب اور نقارہ و نشان مرحمت ہوا۔ اور خدمت رسد رسانی اور انتظام راہ شاہدرہ سے مالاگڈھ تک کی سپرد کی گئی۔ اور مسمی سایمل انگریزوں کی رسد چھیننے کے لئے باغپت کے علاقہ پر تعینات ہوئے چند روز انھوں نے ہنگامہ جاری رکھا لیکن کرم علی خان ڈپٹی کلکٹر کے ہاتھ سے مارے گئے ان کے بعد ان کا نواسہ ان کی جگہ پر مقرر ہوا اور یہ بہت دن تک لوٹ مار کرتا رہا فوج شاہی کے فرار ہونے تک اسکی ڈاکہ زنی جاری رہی ؞

ہر چند کہ مرشد زادے اور بعض عمائدین اپنی بے عقلی اور طمع نفسانی کی وجہ سے خلعت اور خطاب کے ملنے سے خوش تھے لیکن تمام عقلمند لوگ اس خلعت کو کفن ہی سمجھتے تھے۔

نواب ولیداد خان سند صوبے داری دوآبہ لے کر ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو بادشاہ سے اجازت لے کر چند سپاہیوں اور تلنگوں اور رنگروٹوں کے ساتھ مالاگڈھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں[۱] اور منشی موہن لال عرف آغا حسن جان بھی چونکہ تلنگوں کے رات دن کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے اس لیئے نواب صاحب مذکور کے ہمراہ روانہ ہو گئے ہر چند کہ آغا حسن جان قدیمی نمک خوار اور خیر خواہ سرکار انگریزی کے تھے اور میں بھی سرکاری وظیفہ خوار ہوں ہم لوگوں کے واسطے یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا کہ ایسے بدخواہ اور دشمن سرکار انگریزی کے ساتھ جائیں لیکن چونکہ روانگی کے وقت نواب ولی داد خان نے قسم کھائی تھی اور عہد و پیمان کیا تھا کہ میں

[۱] یعنی مصنف کتاب ۱۲ ؞

سرکار انگریزی سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔ ظاہرا بادشاہ کا خیر خواہ رہوں گا لیکن دل سے انگریزوں کی خیر خواہی کروں گا۔ اس وجہ سے ہم لوگ ان کے عہد و پیمان پر بھروسہ کرکے ان کے ساتھ ہوئے تھے آخرکار پشیمانی اٹھانی پڑی[1]۔

نواب صاحب مذکور اول غازی نگر پہونچے اور وہاں کا انتظام کیا وہاں کے تحصیلدار اور تھانہ دار نے حاضر ہوکر نواب صاحب کو نذر گزرانی اور حکومت دوآبے کی مبارکباد دی۔ نواب صاحب نے وہاں کا انتظام کرکے سو سپاہی سڑک کی نگہبانی اور قصبہ کے انتظام کے واسطے تحصیلدار اور تھانے دار کے متعلق کیئے اور مسمی مہربان علی خان اور مظفر علی خان کو معہ ان کے دونوں بھائیوں کے جوامروہہ کے رہنے والے تھے سواروں میں رکھ کر ایک رات دن وہاں قیام کیا اور مذکورہ سواروں کو لےکر روانہ ہوئے ایک رات موضع دادری میں ٹھہرے تیسرے دن شام کے قریب مالاگڈھ میں داخل ہوئے اور دو روز کے بعد ہر پرشاد مختار کے ہاتھ ظاہری چاپلوسی سے آموں اور خربوزوں۔ رنگتروں کی چند ڈالیاں سپسٹ صاحب کلکٹر ضلع بلند شہر کی خدمت میں بھیجیں ہر پرشاد مختار نے بعد رسم سلام وغیرہ کے ڈالیاں کلکٹر صاحب کو پیش کیں صاحب ممدوح نے نہایت خندہ پیشانی سے نواب صاحب کا حال پوچھا اور ڈالی قبول کرلی دو دن کے بعد نواب صاحب منشی موہن لال صاحب عرف آغا حسن جان اور محمد اسمٰعیل خان کو ہمراہ لےکر معہ چند سواروں کے کلکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کو گئے ایک باغ میں جو بلند شہر سے متصل تھا دونوں کی ملاقات ہوئی نواب صاحب نے دیر میں پہونچنے کا عذر کیا اور خیر خواہی کا آئندہ کے واسطے اقرار کیا اور بہت سی باتیں ظاہرداری کی بنائیں جس سے صاحب بہت خوش ہوئے نواب صاحب رخصت ہوکر چلے آئے اور تین دن

---

[1] معلوم ہوتا ہے مصنف کتاب سے بازپرس ہوئی ہوگی اسلیئے ان کو یہ عذر لکھنا پڑا۔ حسن نظامی

کے بعد پھر حاجی محمد منیر خان و آغا حسن جان صاحب اور محمد اسمٰعیل خان صاحب کو ہمراہ لے کر مع ہر پرشاد مختار کے کلکٹر صاحب سے ملاقات کرنے گئے اور بیان کیا کہ میں سرکار انگریزی کا قدیمی وظیفہ خوار ہوں صرف ظاہری طور پر صوبہ دوآبہ کی سند لے کر اپنی جان بچائی ہے کہ بغیر اس صورت کے کوئی صورت ممکن نہ تھی لیکن سرکار کی خیر خواہی میں کوئی امر خلاف مرضی سرکار کے نہ ہوگا کپتان کھرٹ صاحب اور سپیٹ صاحب نے کہا کہ آپ کے بزرگوں نے خیر خواہی کی بنا پر اعلےٰ مرتبہ حاصل کیا اور صاحب جاگیر ہوئے اگر آپ بھی اسی طرح خیر خواہ سرکار انگریزی رہینگے تو آپ کی بھی آپ کے بڑوں کی طرح پرورش کی جائے گی بصورت دیگر بجز پشیمانی اور کچھ حاصل نہ ہوگا اس لیئے کہ ہمارے چند انگریزوں کے مر جانے سے ہماری کل قوم مفقود نہیں ہوسکتی۔ آپ دیکھیں گے کہ چند روز کے بعد ہزاروں گورے اور سینکڑوں صاحب لوگ تمام ہندوستان میں نظر آئیں گے۔ نواب صاحب نے یہ سب باتیں تسلیم کیں اور رخصت ہو کر مالاگڈھ میں پہونچے ۔

دوسرے دن نمبر دار موضع سائل پور جس کے بیٹے چاند خان کو کلکٹر صاحب نے بغیر ثبوت جرم پھانسی دے دی تھی سو سوار اور پچاس پیادوں کو ساتھ لے کر نواب صاحب کی خدمت میں آیا اور کلکٹر صاحب کی شکایت کی نواب صاحب نے کہا کہ تم خاطر جمع رکھو اچھی طرح سمجھا جائے گا۔

موہن لال صاحب نے ازراہ خیر خواہی ان تمام حالات سے بذریعہ چٹھی انگریزی کلکٹر صاحب کو اطلاع دیدی یہ اطلاع ملنے پر کلکٹر صاحب نے ایک خط نواب ولی داد خان کو اس مضمون کا لکھا کہ سننے میں آیا ہے کہ موضع سائل پور کے زمیندار آپکے اغوا سے دنگہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں اگر ایسا ہوا تو تم کو پھانسی

دے دی جائے گی۔ اور علاقہ ضبط ہو جائے گا۔ نواب ولی داد خان نے اس کے جواب میں ایک خط عذر و لجاجت آمیز لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ میں فرمانبردار ہوں اگر حکم ہو تو حاضر ہوں اور آپ کی خدمت کروں اور قلعہ تعلقہ جس کو آپ حکم دیں اس کے سپرد کر دوں اور خود دوسری جگہ چلا جاؤں اس کے جواب میں کلکٹر صاحب نے دوسرا خط صلح و آشتی کا لکھا چونکہ دونوں طرف سے ظاہری دکھاوے کی باتیں تھیں اس لئے کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور نواب ولی داد خان کا نتیجہ برا ہوا۔

مالا گڈھ پہونچنے کے بعد وہاں کی نظامت سے مغرور ہو کر چند روز تو جبراً قہراً اپنے قول و قرار پر قائم رہے اور جب مفسدوں کی فوج وغیرہ فراہم ہو گئی تو سرکشی پر کمر باندھی اور رہزنی اختیار کر کے سرکاری ڈاک روک لی اور سامان جنگ کی فراہمی میں مشغول ہو گئے اور ہم دونوں کو خیر خواہ سرکار انگریزی سمجھ کر اور مخبر و جاسوس جان کر ایک کوٹھڑی میں قید کر دیا۔ ذرا خیال مروت نہ کیا صاحب کلکٹر تعلقہ داروں کی انحرافی سے ناراض ہو کر اور مصلحت وقت دیکھ کر میرٹھ چلے گئے اور اس حال کی رپورٹ لفٹننٹ گورنر کو دیدی ایک ہفتہ کے بعد جب صاحب کلکٹر کو معلوم ہوا کہ مفسدوں کی فوج پورب سے آئی ہے اور انھوں نے بلند شہر میں پڑاؤ کیا ہے تو سب اسباب وغیرہ چھوڑ کر ہاپڑ کی طرف چلے گئے جب ولی داد خان کو صاحب کلکٹر کے چلے جانے کی خبر معلوم ہوئی اور معلوم ہوا کہ بلند شہر حکام سے خالی ہو گیا ہے تو اسیوقت محمد اسمٰعیل خان کو پچاس سوار اور چالیس تلنگے اور ایک توپ دے کر بلند شہر کے انتظام کے واسطے روانہ کیا۔ اسمٰعیل خان نے اسی وقت بلند شہر پہونچکر وہاں کا انتظام اور شہر کا بندوبست کیا اور کلکٹر صاحب کا اسباب کوتوالی میں مقفل کر دیا۔ علی الصباح کلکٹر صاحب یہ سن کر کہ باغیوں کی فوج مقام چولا سے جو بلند شہر سے چار کوس

کے فاصلہ پر ہے گزرے گی بلند شہر میں داخل ہوئے اور اسمٰعیل خان کو طلب کیا اس وقت اسمٰعیل خان نواب صاحب کے کام میں لگے ہوئے تھے اور کلکٹر صاحب نے جو توپیں مالاگڈھ سے منگوا کر کوٹھی میں ڈلوا دی تھیں وہ نکلوا رہے تھے اور تقریباً چالیس تلنگے اور ایک توپ گراب سے بھری ہوئی کوتوالی کے دروازہ پر لگی ہوئی تھی محمد اسمٰعیل خان اس طرف سے روانہ ہوئے اور کلکٹر صاحب دوسری طرف سے دونوں سے بازار میں ملاقات ہوئی۔ کلکٹر صاحب نے کوتوالی کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور اپنے ہمراہی سواروں سے کہا کہ اس جگہ ہم کو دغا معلوم ہوتی ہے کلکٹر صاحب کے خیال میں یہ بات آئی کہ توپ اور تلنگے ہم سے لڑنے کے واسطے کھڑے ہیں ہر چند اسمٰعیل خان نے اس بارہ میں بے حد انکار کیا لیکن کلکٹر صاحب نے کچھ نہ سنا اور ایک طپنچہ کا فیر کیا ایک شخص کے پاؤں میں لگا اس وقت تلنگوں نے بھی توپ میں بتی لگائی اور کلکٹر صاحب تین گراب کھا کر معہ دوسو سواروں کے ہاپڑ کی طرف چلے گئے اور محمد اسمٰعیل خان مہربان علی خان کو بلند شہر کا کوتوال بنا کر اور وہاں کا انتظام کر کے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے اور اس معرکہ کا سارا حال ان سے بیان کیا اسی دن سے تباہی اور فساد کی جڑ قائم ہوئی اور دونوں جانب سے خط و کتابت اور ظاہری اتفاق موقوف ہو گیا اور درون بدن عداوت و رنجش بڑھتی گئی یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت پہنچ گئی۔

چونکہ گورنر جنرل کا حکم کمانڈر انچیف اور تمام صاحب لوگوں کے پاس پہونچ گیا تھا کہ فتح دہلی تک کسی سے جنگ نہ کی جائے اس لیئے کلکٹر صاحب نے نواب صاحب کی سزا دہی کا خیال نہیں کیا اور گورنر جنرل کے حکم کی تعمیل میں میرٹھ کی طرف چلے گئے اور نواب صاحب سامان جنگ کی فراہمی اور سواروں کی دیکھ بھال

میں مشغول ہو گئے اور حکام انگریزی دہلی کی جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اسی زمانے میں تقریباً تین سو سپاہی تلنگے روتے پیٹتے نواب ولیداد خان کے پاس پہونچے اور بیان کیا کہ ہم بہت کچھ سامان نقد و جنس لے کر مالاگڈھ کی طرف آرہے تھے کہ موضع کلی ہٹونہ کے زمینداروں نے ڈاکہ ڈال کر ہم سب کو گرفتار کر لیا اور سب سامان وغیرہ چھین کر موضع سے باہر نکال دیا۔

نواب صاحب نے محمد اسمٰعیل خان کو جو بہادر اور دلیر آدمی تھے پچاس سوار اور دو توپیں دے کر موضع کلی ہٹونہ سے وہ تمام سامان جو وہاں کے زمینداروں نے تلنگوں سے چھین لیا تھا واپس لانے کے واسطے بھیجا۔ محمد اسمٰعیل خان موضع مذکور میں اپنے کیل کانٹے سے درست ہو کر پہونچے اور وہاں کے زمینداروں سے وہ سامان طلب کیا وہاں کے زمیندار اور نمبردار وغیرہ بہت عقل مند تھے انہوں نے چار دن تک اسمٰعیل خان کی خوب خاطر مدارات کی اور اندر ہی اندر خفیہ طریقہ سے زنبیل صاحب کلکٹر سابق بلند شہر کو خبر بھیجدی۔ کلکٹر صاحب کو جونہی خبر ملی وہ فوراً اسی وقت دو سو سوار اور دو توپیں لے کر موضع مذکور کی طرف روانہ ہو گئے اور صبح کو جب قریب پہونچ گئے تو کسی شخص نے اسمٰعیل خان کو ان کے آنے کی خبر پہونچا دی۔ اسمٰعیل خان اسی وقت سوار ہو کر راستہ سے بچ کر مالاگڈھ پہونچ گئے اور کلکٹر صاحب موضع گلاوٹی جو موضع کلی ہٹونہ کے قریب ہے اور نواب صاحب کے علاقہ میں ہے پہونچے اور پوچھا کہ اسمٰعیل خان کہاں ہے جو نائب صوبہ ہے صوبہ بھاگتا نہیں ہے یہ کس طرح کا نائب ہے کہ لڑائی کے خوف سے بھاگ گیا اس قسم کی باتیں کر کے میرٹھ واپس چلے گئے۔

چند روز اس طرح گزرنے کے بعد نواب صاحب نے پھر اسمٰعیل خان کو ڈیڑھ سو سوار اور دو سو پیادے اور تین توپیں اور میگزین وغیرہ دیکر روانہ کیا اور

اُمیّن گوجر کی ایک ہزار گوجروں کی جمعیت بھی ساتھ کی اور موضع کلی بٹونہ کی طرف روانہ کیا یہ لوگ موضع مذکور کے لوٹنے کے واسطے روانہ ہوئے موضع مذکور کے زمینداروں نے معرکہ سے دو تین روز قبل نواب صاحب کے توپچیوں کو روپیہ کا لالچ دے کر بلکہ کچھ تھوڑا بہت پیشگی بھی دے کر اپنا طرفدار بنا لیا تھا۔

موضع مذکور کے زمینداروں نے بہت کچھ منت سماجت اور عاجزی انکساری کی اور دو ہزار روپیہ نقد اور نذر بھینٹ قاعدہ کے موافق محمد اسمٰعیل خان کو پیش کی لیکن اسمٰعیل خان نے کچھ نہیں لیا اور کہا کہ جب تک دس ہزار روپیہ نقد اور کل مال و جنس تلنگوں اور مسافروں کا جو لوٹا ہے نواب صاحب کی خدمت میں نہ پہونچا دو گے لڑائی سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ اسی تکرار میں ایک رات دن گزر گیا دوسرے روز دوپہر کے قریب دونوں طرف سے لڑائی ٹھن گئی۔ توپچیوں نے توپیں مارنی شروع کر دیں کہ ایک دم تقریباً تین ہزار جاٹ تلواریں اور تفنگ ہاتھوں میں لئے ہوئے مقابلہ کے لیئے نکلے پہلے مسمی اُمین گوجر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے معہ اپنی جماعت کے اسمٰعیل خان کو چھوڑ کر میدان سے بھاگ نکلا اس کے بعد محمد اسمٰعیل خان کے کل توپچی تینوں توپوں کو چھوڑ کر گاؤں میں بھاگ کر داخل ہو گئے یہ رنگ جب سواروں نے دیکھا کہ توپچی اور گوجر بھاگ گئے تو وہ بھی جاٹوں کی کثرت دیکھ کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اب صرف اسمٰعیل خان اپنی بہادری اور جرأت سے تیرہ سواروں کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے آخر ایک گولی محمد اسمٰعیل خان کے لگی اور وہ بھی زخمی ہو گئے۔ جب محمد اسمٰعیل خان زخمی ہو گئے تو ان کے ہمراہی سواران کو سمجھا بجھا کر لڑائی کے میدان سے ہٹا لائے اور مالاگڈھ کی طرف ان کو لے گئے۔ جب اس طرح لڑائی کا خاتمہ ہو گیا تو موضع کے زمیندار تینوں توپیں میدان جنگ سے اٹھا کر لے گئے۔

محمد اسمٰعیل خان زخمی ہوکر جب مالاگڈھ میں پہونچے تو نواب ولی داد خاں نے مصلحت وقت سمجھ کر محمد اسمٰعیل خان کی بہت دلجوئی کی اور ان کی مرہم پٹی کی لیکن محمد اسمٰعیل خان چونکہ ایک بہادر آدمی تھے وہ اپنی اس شکست سے نہایت غمگین اور ملول تھے اور کہتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہوگا یا تو موضع کلی بٹونہ کو تباہ و برباد کرکے چھوڑ دوں گا یا اپنی جان دے دوں گا۔ اس ہزیمت اور پسپائی سے جو کچھ عزت اور دھاک نواب صاحب اور محمد اسمٰعیل خان کی تھی بالکل جاتی رہی اس کے بعد سے نواب صاحب کے علاقہ میں بدعملی اور بے ترتیبی چاروں طرف پھیل گئی اور ان کی ہوا اکھڑ گئی۔ روپیہ بھی وصول ہونا بند ہوگیا اور آنے جانے والوں کا راستہ رک گیا۔ اس شکست کا نواب صاحب پر بھی یہ اثر ہوا کہ انھوں نے دو وقت تک کھانا نہیں کھایا بلکہ ایک روز تو شرم کے مارے گھر میں سے نہیں نکلے نہ کسی سے بات چیت کی۔ جب یہ خبر حکام انگریزی کو پہونچی تو وہ بہت خوش ہوئے اور خوب ہنسے۔

اگرچہ نواب ولی داد خان کے پاس تقریباً سات ہزار سوار اور تین ہزار پیادے رنگروٹ تھے اس کے علاوہ ضرورت کے لائق ہر قسم کا سامان بھی موجود تھا اور روپیہ پیسہ بھی انھوں نے بہت پیدا کر لیا تھا لیکن جب دن سے موضع کلی بٹونہ کے زمینداروں نے شکست دی تھی اس روز سے نہ وہ باوجود اپنی اس جماعت کثیر کے مطمئن نہ تھے نہ ان کے چہرہ پر بشاشت تھی۔

چند روز میں محمد اسمٰعیل خان کے زخم اچھے ہوگئے اور ان کا ارادہ تھا کہ کلی بٹونہ کے لوگوں کو اسکی سزا دوں کہ اتنے میں اچانک ایک دن صبح کو دو ہلکارے مالاگڈھ پہنچے اور انھوں نے خبر دی کہ ترنیل صاحب نے دو سو گورے اور تین سو سوار دیسی اور چار توپیں لے کر ہاپڑ کے میدان میں پڑاؤ کیا ہے اور ان کا ارادہ مالاگڈھ پر حملہ کرنے کا ہے یہ خبر

سُن کر محمد اسمٰعیل خان نے نواب صاحب سے کہا کہ مالاگڈھ اور ہاپڑ کے درمیان صرف بارہ کوس کا فاصلہ ہے تعجب نہیں ہے کہ یہ خبر سچ ہو۔ چونکہ ترتیل صاحب بہت بہادر آدمی ہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رات کو چھاپہ ماریں اس لیئے مناسب ہے کہ میں اسی وقت فوج لے کر راستہ روک دوں نواب صاحب نے بھی اس کو مناسب جانا چنانچہ اسی دن قریب شام کے محمد اسمٰعیل خان اور حاجی محمد منیر خان ساڑھے تین سو سوار اور دوسو پیادے ساتھ لے کر موضع گلاؤٹی کی طرف جو ہاپڑ اور مالاگڈھ کے درمیان ہے روانہ ہو گئے۔ گلاؤٹی کے لوگ انگریزی لشکر کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر ایک نالے کے پل پر جو گلاؤٹی اور ہاپڑ کی سڑک پر ہے پڑے ہوئے تھے اور وہیں رات بسر کی تھی۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی جیسی آمادگی اور ہوشیاری دکھلاتے تھے ویسی ہوشیاری و آمادگی ان میں نہ تھی اس لیئے اسمٰعیل خان کے ہمراہی جو رنگروٹ تھے اور کبھی ان کو لڑائی بھڑائی کا تجربہ نہیں ہوا تھا کچھ تو زین بچھا کر سو گئے کچھ پیاسے بیٹھے ہوئے تھے کچھ شراب پی رہے تھے کہ یکایک صبح کاذب کے وقت ترتیل صاحب اپنی فوج لیئے ہوئے نواب صاحب کی فوج پر بجلی کی طرح آن پڑے اندھیرے کی وجہ سے کچھ پتہ نہ چلا۔ دوست دشمن کی تمیز نہ تھی اس معرکہ میں تقریباً چالیس پیادے نواب صاحب کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل گئے اور کچھ سوار مارے گئے اور چند زخمی ہوئے اور اسمٰعیل خان بھی زخمی ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اسمٰعیل خان کی تمام فوج پراگندہ اور منتشر ہو کر اس طرح بھاگی کہ کچھ تو خان پور کی طرف منہ اٹھا کر چلدیئے کچھ خورجہ اور بلند شہر کی طرف نکل گئے۔ کچھ قصبہ بگراسی چلے گئے۔ الغرض جس کا جدھر منہ اٹھا چلدیا تین سو پچاس سواروں میں سے ستر سوار مالاگڈھ میں پہونچے باقی ادھر ادھر چھپ گئے۔

ترتیل صاحب نے توپیں مارتے ہوئے بھاگنے والوں کا گلاؤٹی تک پیچھا

کیا اور گلاؤٹی پہونچ کر وہاں کے تحصیلدار اور نمبردار کو گرفتار کر لیا اور جتنا روپیہ باقی کا چاہیئے تھا سب وصول کر لیا دو گھنٹہ وہاں قیام کر کے پھر پہاڑ کی طرف واپس ہو گئے۔

نواب ولی داد خان کے پاس جب بھگوڑے سپاہی پہونچے تو وہ بہت لال پیلے ہوئے اور سپاہیوں پر بڑی لعنت ملامت کی تین دن میں تمام بھاگے ہوئے لوگ پھر مالاگڈھ میں جمع ہو گئے نواب صاحب بہت غمگین اور رنجیدہ تھے کہ اسی دن امیر علی خان وامراؤ بہادر پسران نواب مظفر علی خان رئیس کھلیا چھ سو سوار اور چار سو پیادے لیئے ہوئے نواب صاحب کی مدد کے لیئے مالاگڈھ آئے ان لوگوں کے آنے سے نواب صاحب کو بہت تقویت ہو گئی۔

دو مہینہ کے بعد آخر جولائی سنہ میں منشی موہن لال آغا حسن جان اور میں بہت کوشش اور جان جوکھوں سے سپاہیوں اور پہرے والوں کو غافل پاکر نکل بھاگے اور گرتے پڑتے خان پور میں نواب محمد مصطفیٰ خان اور نواب غلام علی خان کے پاس پہونچے اور خدا کا شکر ادا کیا زیادہ تر شکر کا باعث یہ ہے کہ ہم لوگوں کے بھاگنے کے تیسرے روز ایک شخص زین العابدین میاں زکی شاعر کا چھوٹا بھائی معہ پچاس سواروں کے نواب ولیداد خان کے ساتھ حق دوستی ادا کرنے اور اپنی دینداری جتلانے کیلئے صرف میرے اور موہن لال کے قتل کرنے کے واسطے مراد آباد سے مالاگڈھ آیا اور اس قدر قتل پر آمادہ و تیار تھا کہ کہتا تھا جب تک ان دونوں کو قتل نہیں کر لوں گا کمر نہیں کھولوں گا۔ لیکن جب باوجود بے حد تلاش و جستجو کے ہم لوگ اس کے ہاتھ نہ آئے تو تھک کر بیٹھ رہا۔ ع

رسید و بود بلائے و لے بخیر گزشت

رئیس مالاگڈھ کی نمک حرامی اور انگریزوں کے ساتھ بغاوت اور مقابلہ بشکست کی خبریں بذریعہ اخبار و انگریزی گزٹ تمام لوگوں کو معلوم ہو گئی ہیں اور محتاج بیان نہیں ہیں اس لیئے میں نے بوجہ طوالت بیان اور کسرشان سرکار انگریزی ان کا اعادہ نہیں کیا کیونکہ ایک زمیندار کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا ذکر نازیبا ہے ہاں بمقابلہ جنگ فرنگ کے ذکر سلطان روم اور شاہ روس و فرانس کا کیا جاوے تو مناسب ہے۔

قصہ مختصر اب میں کچھ ذکر دہلی کی پہلی چہل پہل اور موجودہ بے رونقی کا کرتا ہوں۔

خدا تلنگوں کو برباد کرے ان کے قدموں کی نحوست سے دہلی ایسی برباد ہوئی کہ ہر طرف ہو کا عالم نظر آتا تھا بازار خاک کوڑے سے اٹے پڑے تھے مکانوں کی حالت پاخانوں سے بدتر ہو رہی تھی سڑکوں پر پیشاب پاخانوں کی نہریں جاری تھیں برخلاف اس کے انگریزی عملداری میں جو رونق دہلی کی تھی اسکو دیکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔

اب وہ وقت آ گیا کہ آسمان کینہ پرور بیموں اور معصوم بچوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیئے تیار ہو گیا اور انگریز آمادہ جنگ ہو گئے۔

پہلا معرکہ

اچانک یکم جون ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت تلنگوں کے لشکر میں خبر پہنچی کہ گوروں کی

فوج غازی آباد کے میدان میں جمع ہوئی ہے یہ سن کر ادہر سے مرزا خضر سلطان مرزا عبداللہ میر نواب اور نواب محمد محسن خان تین پلٹن چھ سو سوار اور چھ توپیں اور بہت سا میگزین وغیرہ لے کر مقابلہ کے لیئے روانہ ہو گئے ان لوگوں نے ہینڈن ندی کے پُل کے قریب مقام کیا یہ لوگ ابھی اپنے مورچے بھی قائم نہ کرنے پائے تھے کہ انگریزی فوج نے تابڑ توڑ گولے اور گولیاں برسانی شروع کر دیں تلنگوں کی فوج ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی۔ لیکن مستعد ہو کر مقابلہ میں ڈٹ گئی پھر تو دونوں طرف سے گولوں اور گولیوں کا وہ مینہ برسا کہ الہی توبہ تمام میدان دھواں دھار ہو گیا اتفاق وقت کہ انگریزی سپاہیوں نے کچھ ایسی تیزی سے گولے برسائے کہ تلنگوں کے پاؤں اُکھڑ گئے آخر نوبت یہاں تک پہونچی کہ تلنگے تین توپیں اور کئی سو بندوقیں اور بہت سا سامان جنگ میدان میں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور قلعہ کے دروازہ سے شہر دہلی میں داخل ہو گئے گوروں نے ان لوگوں کا پیچھا نہیں کیا بلکہ غازی نگر ہی میں قیام کر کے جن لوگوں پر بدخواہی سرکار انگریزی کا گمان تھا ان کو سزائیں دیں اور مقتولین کو دفن کیا اور زخمیوں کو ساتھ لے کر بموجب حکم کمانڈر انچیف دوسرے لشکر کے ساتھ شامل ہونے کے واسطے علی پور کی طرف دوسرے دن روانہ ہو گئے۔

باغیوں کی فوج نے ابھی کمریں بھی نہ کھولی تھیں کہ انگریزی لشکر نے علی پور پہونچکر کامیابی کا جھنڈا گاڑ دیا۔ جب یہ خبر باغیوں کو پہونچی تو یہ لوگ بھی لڑائی کے لیئے تیار ہو گئے اور میر نواب پسر میر تفضل حسین وکیل و میر فتح علی مرزا مغل سپہ سالار کے حکم سے بہت سی فوج اور توپیں اور سامان جنگ لے کر علی پور روانہ ہو گئے چار گھڑی دن باقی تھا کہ یہ لوگ علی پور کے قریب پہونچ گئے اور سرائے بادلی پر ڈیرے ڈال دیئے دن نکلنے سے پہلے ہی انگریزوں نے ایک عجیب چال چلی یعنی پانچسو

گوروں نے لباس بدل کر عمامہ وغیرہ باندھ کر بالکل مسلمانوں کی شکل بنالی اور اپنے دو سواروں کے ہاتھ باغیوں کی فوج میں کہلا بھیجا کہ ہم مسلمان ہیں اور جو تھے رسالہ کے ہیں بادشاہی فوج میں شامل ہونے کے واسطے آئے ہیں ان لوگوں کو یقین آگیا اور اجازت دے دی کہ آیئے اور دینی لڑائی میں شرکت کیجئے۔ گورے مخالفین کے لشکر کے قریب ہی جواب کے منتظر کھڑے تھے اجازت ملتے ہی باغیوں کی فوج میں چلے آئے اور زور سے کہا سلام علیکم۔ اور سامنے آتے ہی ان غافل لوگوں پر بندوقوں کی ایک باڑ چلائی ظاہر ہے کہ بےخبری کے عالم میں ان پر حملہ کا کیا اثر ہوا ہوگا پانسو بندوقوں کی ایک دم باڑ نے تلنگوں کے حواس کھو دیئے آخر اس اچانک حملہ سے گھبرا کر گیارہ توپیں اور میگزین وغیرہ چھوڑ کر بھاگے گوروں نے تعاقب کیا اور باڑھ مارتے ہوئے اجمیری دروازہ کی فصیل تک پہونچ گئے۔

جب بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہوئی اب دیکھئے آیندہ کیا ہوتا ہے گوروں کی فوج اجمیری دروازہ سے واپس ہوئی اور پہاڑی کے مورچہ اور باؤنہ کے مورچے جن پر تلنگوں کا قبضہ تھا حسن تدبیر سے لڑ بھڑ کر چھین لیئے اگر انگریزوں کو منظور ہوتا تو اسی دن دہلی فتح ہو جاتی۔ لیکن انگریزوں نے احتیاطاً شہر میں قدم نہیں رکھا اور پہاڑی اور باؤنہ کی ان توپوں کا منہ جو تلنگوں سے حاصل کی تھیں قلعہ کی طرف کر دیا اور ایسے قرینہ سے توپیں لگائیں کہ باغیوں کو ایک قدم آگے بڑھنے اور ایک منٹ وہاں ٹھیرنے کی تاب نہ رہی۔

ایک دن چھاؤنی نصیرآباد کی فوج ہمت کر کے پہاڑی مورچے پر پہونچ گئی اور اس مورچہ کی توپیں چھین لیں اور کچھ گوروں کو قتل کر دیا کچھ گورے توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے انگریزی افسروں نے یہ چالاکی کی کہ اس جگہ بہت سے روپے اور چاندی وغیرہ کے

برتن بکھیر دیئے یہ لالچی ان چیزوں پر ایسے ٹوٹ کر گرے جس طرح بھوکا کبوتر دانے پر گرتا ہے گورے گھات میں لگے ہوئے تھے جب انھوں نے ان کو غافل پایا فوراً بندوق کی باڑ ماردی۔ سینکڑوں تو وہیں ڈھیر ہو گئے اور جو بچے وہ زخمی ہو کر بھاگ گئے روزانہ یہی ہوتا تھا کہ کئی کئی ٹولیاں تلنگوں کی ہمت کر کے آتی تھیں اور سپاہی جان پر کھیل کر پہاڑی کی بلندی تک پہونچ کر توپیں چھین لیتے تھے لیکن آس پاس سے جو توپوں کی مار پڑتی تھی تو گھبرا کر پہاڑی سے اتر آتے تھے۔

ایک دن انگریزی فوج نے بڑی بہادری کی تینوں پلٹنیں چھاؤنی میرٹھ اور وزیرآباد کی کوٹھیوں کا سامان وغیرہ لوٹ کر خوب مالدار ہو گئی تھیں اور پلٹن والے ہر موقعہ پر لڑائی سے بچتے رہتے تھے۔ ایک رات ان میں سے پانسو جوان اور سپاہیوں کے طعن و تشنیع سے شرما کر قدسیہ باغ کے مورچے پر گئے وہاں جا کر کوئی تو ان میں سے بھنگ پینے میں مشغول ہو گیا کوئی توشہ دان کا تکیہ بنا کر سو گیا۔ الغرض سب کے سب غافل پڑے ہوئے تھے کہ انگریزی لشکر اچانک ان غافلوں کے سروں پر پہونچ گیا اور سینکڑوں کو ذبح کر ڈالا بہت سے سپاہیوں کے ناک کان کاٹ ڈالے جو اتفاق سے بچ گئے وہ بھاگ کر اپنے ٹھکانے پر پہونچ گئے۔ انگریزی لشکر کے سپاہی چھاپہ مار کر تلنگوں کی تین توپیں لے کر اپنے مورچے کو واپس ہو گئے۔ الغرض ایک مہینہ تک اسی طرح کی لڑائیاں ہوتی رہیں کہ اتنے میں مسمی بخت خاں، محمد شفیع تلنگوں کی چار پلٹنیں اور ایک ہزار پانچ سو جہاد کرنے والے قریب قریب بارہ ہزار کی جمعیت لے کر معہ توپ خانہ اور میگزین وغیرہ جولائی کے مہینہ میں دہلی پہونچے۔ دہلی دروازہ کے باہر قیام کیا اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ کی طرف سے ان کو خلعت

عطا ہوا اور عہدہ جرنیلی پر سرفراز کیے گئے۔ اس عرصہ میں بے شمار فوجیں چھاؤنی پنیج نصیر آباد حصار لکھنؤ متھرا و کیسولی سے آکر دہلی میں جمع ہوئیں بادشاہ کو ان کے آنے سے مسرت ہوئی اور رعایا بھی مطمئن ہوگئی۔

جب مدت ختم ہوگئی تو دونوں طرف سے گولہ باری شروع ہوئی سپاہی بے چارے ہر مقام پر بہادری کا ثبوت دیتے تھے لیکن اپنی جانیں کھو کر آخر پسپا ہوتے تھے اور سامان جنگ بھی چھوڑ آتے تھے۔ فتح و شکست تو اسی بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ انگریزوں کا جھنڈا تو پہاڑی پر اڑ رہا تھا اور باغیوں کا جھنڈا مدار صاحب رہ کے نیزے کی طرح گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور پہاڑی کے نیچے خون کی ایک نہر جاری تھی جس میں سینکڑوں لاشیں مچھلیوں کی طرح تیرتی تھیں۔ الغرض روزانہ لڑائی کا یہی ڈھنگ جاری تھا کہ نواب مظہر علی خان رئیس کھلیا کے چھوٹے بیٹے امداد بہادر عرف کا مونہ ایک ہزار سوار اور پیادے لے کر اگست کے مہینہ میں بادشاہ اور باغیوں کی مدد کے لیے دہلی پہونچے اور چند روز قیام کرکے اور سامان جنگ درست کرکے جوانی کی ترنگ میں پہاڑی کا مورچہ چھیننے کے لیے انگریزی فوج کے مقابلہ میں گئے مگر ان کے بندوق کی ایک گولی لگی اور چند روز میں اس صدمہ سے انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال سے بادشاہ کو ان کی جوانی اور جوانمردی کی بنا پر بہت رنج ہوا۔ مرشد زادوں کا حال کیا بیان کیا جائے احمد مرزا مرزا فاضل بیگ میر نواب حکیم عبدالحق قاضی فیض اللہ کوتوال شہر اور عبدالحکیم ان کی نیابت میں تھے اور شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش اور بدوضع لوگ ہر وقت مصاحبت میں رہتے تھے۔ جو ہر وقت ساہوکاروں شہر کے امیروں سے روپیہ اینٹھنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے تمام شاہزادے اس لالچ میں مبتلا تھے خاصکر مرزا مغل اور

مرزا خضر سلطان چونکہ یہ دونوں بہت تجربہ کار اور سب میں سربرآوردہ تھے اور فوجی تقویت بھی حاصل تھی انھوں نے بہت ظلم پر کمر باندھی اور ان کے مصاحبوں نے خوب رشوتیں لینی شروع کیں ساہوکاروں اور شہر کے رئیسوں کو بلا بلاکر ان سے روپیہ لیتے تھے اور اپنے حفظ نفس کے لیئے خوب خرچ کرتے تھے۔

قلعہ اور شہر کے اکثر مکان انگریزی توپوں کے گولوں سے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے خاصکر کشمیری دروازہ کا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہاں کے تمام مکانات چھلنی ہو گئے تھے وہاں کے سوداگر اور رہنے والے دوکانیں اور کوٹھیاں چھوڑ چھوڑ کر دہلی دروازہ آ گئے تھے کہ اسی درمیان میں خان پور، لکھنؤ، فرخ آباد بریلی، رام پور وغیرہ سے بادشاہ کی خدمت میں تحفے اور نذریں معہ عرضیوں کے سفیروں نے پیش کیں بادشاہ نے سب کو قبول کر لیا اور ان کی عرضیوں کے جواب اور سفیروں کو رخصتی خلعت عطا کئے اور وکیل اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس ہوئے یہاں دہلی میں دونوں طرف سے رات دن لڑائی جاری تھی کہ ایک دن نصیر آباد کے باغیوں کی فوج نجف گڈھ میں معہ توپوں اور میگزین کے مورچے بنا کر گھات میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اتفاقاً بارش ہو گئی اور ان لوگوں کی محنت سب برباد گئی اسپر مصیبت یہ نازل ہوئی کہ گوروں کی فوج آفت ناگہانی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑی اور گولے مارنے شروع کر دیئے تھوڑی دیر تو دونوں طرف سے خوب لڑائی ہوئی۔ آخر کار نصیر آباد کی فوج پسپا ہوئی اور گیارہ توپیں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی اس روزانہ کی شکست اور پسپائی سے افسروں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں روزانہ یہی ہوتا تھا کہ باغیوں کی فوجیں ہمت کر کے میدان میں جاتی تھیں اور جب گورے پہاڑی سے نیچے اتر کر حملہ کرتے تھے اور ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی توپیں لے کر گراب برساتے تھے تو سب بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور گورے مارتے ہوئے

سب کو شہر میں داخل کر کے اپنے مورچوں پر واپس چلے جاتے تھے۔

ایک دن ایک مخبر نے خبر دی کہ گورے اور خاکی سپاہی مجذوب علی خان کے باغ میں مورچہ بنا رہے ہیں یہ خبر سنتے ہی تلنگوں کے افسروں نے اسی وقت تین پلٹنیں اور ایک ہزار سواروں کو چند توپیں دے کر مقابلہ کے لیے بھیجا جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور دونوں طرف سے گولہ باری شروع ہوئی تو انگریزوں میں سے ایک انگریز نے ایک عجیب بہادری کا کام کیا کہ جس کو سنکر حیرت ہوتی ہے یعنی ایک انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی تیزی سے تلنگوں کی فوج میں گھس آیا اور بڑی پھرتی سے گھوڑے پر سے اتر کر ایک توپ کے اوپر سوار ہو کر توپ کے پیالہ میں ایک لوہے کی میخ ٹھونک دی اور ایک شخص کی تلوار سے وہیں ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد تلنگے انگریزی فوج سے لڑنے کے لیے باغ میں پہونچے اور حملہ کر دیا اچانک دو سو گورے دستی توپیں لیے ہوئے پہاڑی سے اتر پڑے اور گراب برسانے شروع کر دیئے۔ آخر تلنگے باوجود اس قدر جمعیت اور اتنے سامان کے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور پہاڑ گنج میں پہونچکر وہاں کے مکانات توڑ پھوڑ ڈالے اور ان کے تختے اور کڑیاں نکال کر شہر میں آ گئے۔

---

۷ اگست کو ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ چوڑی والوں کے محلہ میں بڑی بیگم کے ایک مکان پر شمرو صاحب باغیوں کے واسطے روزانہ ۲۵ من بارود تیار کرتے تھے اتفاقاً کسی شخص نے اس کارخانہ میں ایک چنگاری آگ کی ڈالدی بارود بھک سے اُڑی اور تقریباً چھ سو کاریگر مرد عورت اس صدمہ سے جلکر خاک ہو گئے تلنگوں کو بدگمانی ہوئی کہ یہ کام حکیم احسن اللہ خان کے اشارے سے ہوا ہے

یہ خیال کرکے تلنگوں نے حکیم صاحب کو قید کر لیا اور ان کا تمام مال واسباب شیشہ آلات اور تصویریں اور قطعہ جو دیواروں پر لٹکے ہوئے تھے اور ہزارہا کی مالیت کے تھے توڑ پھوڑ ڈالے اور مکان کی چھت میں آگ لگا دی اور ان کا اسباب وغیرہ چھکڑوں پر لاد کر لے گئے اور حکیم صاحب کے قتل پر آمادہ ہوگئے لیکن بادشاہ نے بڑی منت سماجت سے حکیم صاحب کی جان بخشی کرائی اور مرزا مغل کو ساتھ کرکے ان کے گھر پر پہونچوا دیا ۔

چند دن کے بعد تلنگے ایک شخص کو گرفتار کرکے بادشاہ کے سامنے کھینچتے ہوئے لائے یہ آدمی لانبے قد کا خوبصورت تھا اور جوگیا لباس پہنے ہوئے تھا۔ تلنگے اس کو لارنس صاحب بہادر سمجھ کر گرفتار کر لائے تھے بادشاہ سے کہا کہ یہ لارنس ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کابل کی لڑائی میں یہ زخمی ہوا تھا چنانچہ اس کے شانہ پر گولی کا نشان موجود ہے اس کو ننگا کرکے گولی کا نشان دکھلایا بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو میرے سامنے سے لے جاؤ اور جو مناسب سمجھو وہ کرو۔ ان کم بختوں نے اسی وقت میدان میں لے جا کر اس بے گناہ فقیر کو گولی سے مار ڈالا۔ اسی دن ان تلنگوں نے ایک اور سوانگ بنایا کسی انگریز کا سر نیزہ پر رکھ کر تمام گلی کوچوں میں پھرایا اور کہا کہ یہ سر جان مٹکاف صاحب کا ہے پھر بادشاہ کے پاس بھی لے گئے اور بادشاہ کے سامنے بڑی شیخیاں بگھاریں کہ بڑی جانفروشی کا کام کیا ہے بادشاہ نے اس کے صلہ میں پچاس روپے انعام دیئے پھر کیا تھا پھر تو یہ لوگ روزانہ ایک نہ ایک شعبدہ ایسا ہی کیا کرتے تھے اور اس طرح بادشاہ سے انعام وصول کرتے تھے ۔

القصہ چار مہینے تک مسلسل اسی طرح لڑائی جاری رہی دونوں طرف امید و بیم کی حالت تھی باغیوں کی فوج شہر دہلی میں محصور تھی اور گوروں کی فوج پہاڑی کے مورچہ پر۔ انگریزوں نے قصداً دہلی کا فتح کرنا نہیں چاہا کیونکہ دوسری فوجوں اور قلعہ شکن توپوں کے آنے کے منتظر تھے بالآخر ستمبر کے مہینہ میں بڑی توپیں پھلور کے قلعہ سے پہاڑی پر آگئیں۔ اس کے بعد انگریزوں نے قدسیہ باغ میں مورچے قائم کرنے شروع کر دیئے۔ جب انگریز مورچے وغیرہ قائم کر کے خوب کیل کانٹے سے درست ہو گئے تو انھوں نے اس کثرت سے قلعہ کے شاہی مکانوں اور شہر پناہ کی دیوار پر گولے برسائے کہ قلعہ اور شہر کے رہنے والے تنگ آگئے تمام لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے صدہا مکان مسمار ہو گئے شہر پناہ کی فصیل بھی ٹوٹ گئی اور بادشاہی خوابگاہ کو بھی صدمہ پہونچا چھ رات دن برابر توپوں سے آگ برستی رہی تمام عالم تہ و بالا ہو گیا۔

آخر وہ دن آہی گیا کہ دلی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو جائے اور چنگیزی نسل کا آخری اور برائے نام بادشاہ عالم ضعیفی میں مصیبتیں جھیلے۔

ستمبر کی چودہ تاریخ کو صبح ہونے سے پہلے گوروں کی تین پلٹنیں اور گورکھا پلٹن اور چند سواروں کے رسالے سیڑھیاں لگا کر جس طرف سے فصیل ٹوٹ گئی تھی فصیل پر چڑھ گئے اگرچہ ان میں سے بہت سے مارے گئے لیکن انگریزوں کا ستارا اقبال اوج پر تھا باغی بھری ہوئی توپیں اور میگزین وغیرہ جہاں تھا چھوڑ چھوڑ کر بھاگے اور انگریزی فوج شاہ برج اور کشمیری دروازے سے فاتحانہ طور پر داخل ہوئی۔ مورچوں میں جو کچھ سامان جنگ ملا اس پر قبضہ کر لیا پھر جب کشمیری دروازہ کابلی دروازہ اور اجمیری دروازہ اور میگزین وغیرہ سب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا

تو انھوں نے پن چکی پر اور نواب حامد علی خان کی کوٹھی کے پاس توپیں لگا دیں جس کی وجہ سے باغیوں کے سب راستے نکلنے کے بند ہو گئے۔ چند گورے جو بے وقوفی سے شہر میں چلے گئے تھے وہ مارے گئے جب بادشاہ کو انگریزوں کے شہر میں داخل ہونے کی خبر پہونچی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ نتیجہ یہی ہونا ہے آخر ان نمک حراموں نے سلطنت کو تباہ کیا اور تیمور کا نام دنیا سے میٹ دیا اور میرا بڑھاپا خراب کیا خیر اب آج میں خود مقابلہ کروں گا۔

سب کو خبر کر دو کہ ہماری سواری کے وقت حاضر ہوں اور مدد کریں۔ چنانچہ بادشاہ خود سوار ہو کر لال ڈگی پر تشریف لائے اور تمام فوج اور رعایا جمع ہوئی لیکن انگریزوں کی گولیاں لال ڈگی تک پہنچتی تھیں اس لیے افسران نے عرض کیا کہ حضور کا یہاں ٹھیرنا مناسب نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ حضور کو کچھ صدمہ پہونچے بادشاہ ان لوگوں کے کہنے سے قلعہ میں چلے آئے اور شہزادوں نے جو فوج کے افسر تھے فوج سے ہر چند کہا کہ ہمت کرو اور مرد بنو لیکن نمک حرام تلنگوں نے بھوک اور رسد نہ ملنے کا بہانہ کر کے جو کچھ دکانیں وغیرہ باقی رہ گئی تھیں لوٹ کھسوٹ کر بھاگنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تلنگوں کی تین پلٹنیں جو سلیم گڑھ اور جھروکہ قلعہ میں متعین تھیں بھاگیں۔ پھر کیا تھا پھر تو ان کی دیکھا دیکھی بھاگڑ پڑ گئی اور جتنی باقی فوج تھی سب بھاگ گئی القصہ چھ روز میں تمام فوجیں فرار ہو گئیں ۱۹ ستمبر ہفتہ کے روز بادشاہ نے مایوس ہو کر تمام بیگمات اور شہزادوں کو رات کے وقت قلعہ سے باہر بھیج دیا اور خود بھی سوار ہو کر درگاہ حضرت نظام الدین اولیا رضؓ میں پہنچے اور پھر ہمایوں کے مقبرے میں مقیم ہوئے قلعہ اور شہر کے تمام لوگ ننگے سر ننگے پاؤں شہر سے باہر نکلے اور جس کا جدھر منہ اٹھا چلدیا کوئی قدم شریف کی طرف بھاگا کوئی پہاڑ گنج چلدیا کوئی جی سنگھ پورہ اکثر درگاہ سلطان جی صاحب اور روشن چراغ دہلی درگاہ

حضرت خواجہ قطب الدین رح حویلی پالم بلب گڈھ فرید آباد جھجر فرخ نگر اور الور وغیرہ کی طرف چلد یئے جب انگریزوں کو معلوم ہوا کہ شہر اور قلعہ بادشاہ اور رعایا سے خالی ہو گیا تو افسر معہ گوروں کی پلٹنوں اور گورکھوں اور ہندوستانی سپاہیوں کے قلعہ میں داخل ہوئے اور شہر کو گھیر لیا ۔

سب سے پہلے انگریزوں نے شہر کے تمام دروازوں کا بندوبست کیا پھر بغاوت کے جرم میں رعایا اور شرفا و رؤسا کو شہر بدر کر دیا اور جس شخص نے مقابلہ کیا وہ مارا گیا اور تمام مال و اسباب و مکان وغیرہ ضبط کر لیا گیا۔ اور بلا امتیاز ہندو مسلمان مجرموں کے تمام مکانات کھدوڈالنے کا حکم ہوا۔ امیروں اور غریبوں کی عورتیں روتی پیٹتی پریشان حال قصبوں اور گاؤں کی طرف اور درگاہوں کی طرف جو شہر سے متصل تھیں نکل گئیں اور جہاں جس کو ذرا سا ٹھکانا پاؤں ٹکانے کا بھی ملا وہیں ٹھہر گیا لیکن ان خستہ حالوں کو گوجروں اور خاکیوں نے کسی جگہ بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا جس کا موقعہ لگتا تھا لوٹ کر چلتا ہوتا تھا یہاں تک کہ لوگ نان شبینہ کو محتاج ہو گئے اور سینکڑوں فاقوں سے ہلاک ہو گئے سینکڑوں بیماریوں کے نذر بھینٹ چڑھ گئے عام لوگوں کے علاوہ تمام شہزادے اور شہزادیاں بھی اسی مصیبت میں مبتلا تھے ۔ اور ان کی حالت سب سے زیادہ دردناک تھی ۔

جب قلعہ اور شہر کا بندوبست ہو گیا تو ایک روز دو انگریز جن میں سے ایک کا نام ہڈسن تھا چند سواروں کو لے کر مقبرہ ہمایوں میں گئے اور بادشاہ کو ایک پالکی میں اور مرزا مغل مرزا خضر سلطان و مرزا ابوبکر کو رتھ میں سوار کر کے قلعہ میں لے آئے بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا اور تینوں شاہزادوں کو کوتوالی کے

سامنے کھڑا کرکے گولی سے اڑا دیا۔ اور نواب زینت محل اور مرزا جواں بخت کو بادشاہ کے قریب ایک علیحدہ مکان میں قید کر دیا اور حکیم احسن اللہ خاں کو حالات اہل قلعہ دریافت کرنے کے لیئے نیز مجرموں اور مفسدوں کی شناخت کرنے کے لیئے ایک دوسرے مکان میں نظر بند کر دیا گیا۔

سینکڑوں مزدور قلعہ اور شہر کے مکانات کھودنے کے لیئے مقرر کیئے گئے مزدور رات دن مکانات کھود کھود کر روپیہ پیسہ نکال کر سرکار میں داخل کرتے تھے۔ جاگیرداروں اور راجوں کے نام پروانے لکھے گئے کہ مفسدوں اور مجرموں کو گرفتار کریں اور پروانوں کے ساتھ چند مخبر بھی شناخت کے واسطے بھیجے گئے۔

سانڈرس صاحب کمشنر مقرر ہوئے اور لیاس صاحب سشن جج اور ایجبرٹن صاحب دہلی کے کلکٹر مقرر ہوئے اور جان مٹکف صاحب مفسدوں کی گرفتاری کے کمشنر مقرر ہوئے ان چاروں صاحبوں نے بہت خوبی سے انتظام کیا۔ اور ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو ایک سال کے بعد جرات کے دن انگریزوں نے بادشاہ کو بال بچوں سمیت کلکتہ بھیجدیا ؞

دہلی فتح ہونے کے چند دن بعد مالا گڈھ کے رئیس اور دیگر تعلقہ داروں کی سرکوبی کے لیئے فوج روانہ ہوئی جب فوج وہاں پہونچی تو مالا گڈھ کے رئیس نے تھوڑی دیر انگریزی فوج سے مقابلہ کیا آخر معہ رئیس کھلیا کے بھاگ کر ۲۵ ستمبر کو بریلی پہونچے۔

انگریزی فوج نے مالا گڈھ کے علاقہ کو ضبط کرکے مالا گڈھ کے قلعہ کو کھود کر زمین کے برابر کر دیا۔ اور بلند شہر کے کلکٹر صاحب نے باغیوں کو بلند شہر خان پور اور خورجہ سے گرفتار کرکے کسی کو پھانسی دی

کسی کو حبس دوام کی سزا دی باقی لوگوں کو میرٹھ بھیج دیا اور کچہری وغیرہ کا کام پھر بدستور جاری ہو گیا اسی طرح دہلی کے حکام نے مجرموں کو گرفتار اور جاگیرداروں وغیرہ کو طلب کر کے قید کر دیا اور سینکڑوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ انہیں جاگیرداروں میں عبدالرحمن خان رئیس جھجر اور راجہ بلب گڈھ بھی تھے ان پر یہ الزام تھا کہ اگر کسی انگریز نے بلوائیوں سے جان بچا کر ان سے پناہ چاہی تو انھوں نے پناہ نہ دی۔ اسی جرم میں ان دونوں کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی جاگیر وغیرہ سب ضبط کر لی گئی قصہ مختصر روزانہ لوگ گرفتار ہو ہو کر آتے تھے اور سزائیں پاتے تھے۔ بعض چھوڑ بھی دیئے جاتے تھے۔ مخبر ہر چہار طرف چھوٹے ہوئے تھے اور انعام کے لالچ میں لوگوں کو گرفتار کراتے تھے۔

---

۲۴ فروری ۱۸۵۸ء کو بدھ کے روز لارنس صاحب چیف کمشنر پنجاب دہلی میں داخل ہوئے جو لوگ شبہ میں گرفتار تھے ان کو چھوڑ دیا گیا حقیقتاً دہلی کی فتح میں انھوں نے بہت کافی حصہ لیا اور رسد و خزانہ و فوج وغیرہ سے بہت امداد کی اگر یہ امداد نہ کرتے تو گوروں کی قلیل فوج سے دہلی کا فتح کرنا نہایت دشوار تھا ان کی ان خدمات کے صلہ میں کمپنی نے ہندوستان کو حکومت پنجاب کے ماتحت کر کے صاحب موصوف کو لفٹنٹ گورنر کر دیا صاحب موصوف کے تشریف لانے کے تین دن بعد دہلی میں دربار عام منعقد کیا گیا اور تمام مظلوموں اور دردمندوں حاجت مندوں نے اپنی عرضیاں پیش کیں صاحب موصوف نے نہایت مہربانی سے لوگوں کی عرضیاں لے کر اہلکاروں اور منشیوں کے سپرد کر دیں اس کے بعد مقدمات کی سماعت کے لیئے ایک عدالت مقرر ہوئی جس میں چار انگریز تھے چونکہ اس سے پیشتر ایسا ہو چکا تھا کہ مخبروں کی مخبری پر سینکڑوں بیگناہ ہوا

کو پھانسی دیدی گئی تھی۔ اس وجہ سے اب یہ طے ہوا کہ جب تک چاروں حاکم فیصلہ پر متفق نہ ہوں سزا نہ دی جائے اس دن سے سوائے مجرموں کے کسی کو سزا نہ دی گئی اور سینکڑوں بے گناہ قیدی چھوڑ دیئے گئے ۔

صاحب موصوف ابھی دہلی کا انتظام نہ کرنے پائے تھے کہ پنجاب کے بلوہ کی خبر پہونچی اور صاحب ممدوح مارچ ۱۸۵۸ء کے آخر میں وہاں کے انتظام کے لیئے سانڈرس صاحب اور حکیم احسن اللہ خان کو لے کر چلے گئے سانڈرس کرنال سے واپس چلے آئے اور حکیم احسن اللہ خان مجرموں کی شناخت کر کے پانی پت سے دہلی میں واپس آگئے اور جو کام ان کے سپرد تھا اس میں مصروف ہو گئے۔ جان مٹکف صاحب کمشنر بیمار ہو کر چھ ماہ کی رخصت پر ولایت چلے گئے۔ ان کی جگہ پر مرفی صاحب مقرر ہوئے یہ چاروں صاحب شہر کا بہت اچھا انتظام کر رہے ہیں اب تک لوگ شہر سے باہر پڑے ہوئے ہیں اور ہزاروں نے دیہات وقصبات میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ الغرض ان فلک کے ستائے ہوئے مصیبت زدوں نے جو نہ دیکھا تھا وہ دیکھا اور جو کبھی نہ سنا تھا وہ اب سنا کیا کیا مصیبتیں تھیں جو دہلی کے رہنے والوں کو نہ اٹھانی پڑیں گھر ویران ہو گئے۔ سینکڑوں بیوائیں ہو گئیں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے جیسی بربادی دہلی کی ہوئی اور جیسی رعایا یہاں کی بے گھری بے دری ہوئی ہے کہیں کی نہ ہوئی ہوگی۔ اور جو مظالم دہلی کی فتح کے بعد دہلی میں ہوئے ایسے کہیں نہ ہوئے ہونگے۔ کچھ شک نہیں کہ باغیوں کے مظالم بہت سخت تھے اور انھوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کو بڑی بڑی سفاکیوں سے قتل کیا تھا مگر دہلی کی فتح کے بعد انگریز جیسی سختی کر رہے ہیں وہ بھی افسوسناک ہے اور انگریزوں کی

انصاف پروری کے خلاف ہے۔

کیا دہلی کے انگریزافسروں کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ہوگی کہ بے گناہ اور شریف عورتیں جن میں جوان بھی ہیں بوڑھی بھی ہیں اوران کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی ہیں۔ دہلی کے باہر جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں نہ ان کے پاس کھانا ہے نہ کپڑا ہے۔ نہ رات کو سونے اور دن کو دھوپ سے بچنے کا ٹھکانہ ہے۔

دہلی کے افسروں نے ان کو ان کے گھروں سے اس لیئے نکال دیا ہے کہ مال اسباب جمع کیا جائے۔

دہلی کے ایک لاکھ مکان مسمار ہوکر کھنڈر بن گئے ہیں اور یہ آباد شہر ایسا ویران ہوا ہے کہ دیکھنے سے رونا آتا ہے۔

مگر میرا خیال ہے کہ چونکہ ابھی اودھ اور بریلی اور میرٹھ اور رڑکی اور الوپ شہر وغیرہ مقامات پر لڑائیاں ہورہی ہیں اور بغاوت قائم ہے اس لیئے دہلی کے افسر لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیئے ایسی سختیاں کررہے ہیں اور ان کو باغیوں کے مرکز شہر کو اچھی طرح دباکر انتظام کرنا مقصود ہے جو کچھ بھی ہو موجودہ حالت تو بہت ہی دردناک اور افسوسناک اور رونے کے قابل ہے۔

دہلی کی پھانسیاں اور گرفتاریاں

لے اب کچھ حال عائدین شہر دہلی کا بھی سینئے

(۱) ۱۷ اکتوبر کو سنیچر کے دن عبدالرحمٰن خان رئیس جھجر گرفتار کیئے گئے کچھ دن دیوان عام میں قید رہے پھر ان کو پھانسی دیدی گئی اور سب علاقہ وغیرہ ضبط کرلیا گیا۔

(۲) ۷ نومبر کو بلب گڈھ کے راجہ ناہر سنگھ بھی پکڑے گئے ان کو بھی پھانسی ہوئی۔

(۳۳) **میاں غلام نظام الدین** صاحب حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کے بڑے صاحبزادے جو حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہیں جن کی تاریخ وفات "چراغ دین" ہے۔ (اس جگہ سے ایک ورق اصل کتاب نہیں ہے۔ شاید گم ہو گیا ہو۔ حسن نظامی) گرفتاری[1] کے خوف سے چند روز قدم شریف کی درگاہ میں بحالت پریشانی بسر کی بعد چند روز کے بلم گڈھ کی طرف چلے گئے اور کچھ دن وہاں قیام کر کے گوالیار چلے گئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ گوالیار سے حیدرآباد چلے گئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنے قدیمی وطن اورنگ آباد کو چلے گئے اور ان کے تمام عزیز و اقارب قید سے رہائی پاکر حکیم محمود خان اور حکیم مرتضیٰ خان کے ہمراہ پٹیالہ جا کر آباد ہو گئے۔

(۴۴) **اور نواب** غلام محی الدین خان عرف بڈھے صاحب رئیس جن کی ایک ہزار روپیہ پنشن کلکٹری سے تھی اور تین سو روپے مہینہ ریاست بھرت پور سے تھے اور پانسو روپیہ کرایہ مکان و دکانوں اور دیہات و باغات وغیرہ کا تھا اور خوب امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے اس ہنگامہ کے زمانہ میں مرزا مغل کے پاس کبھی کبھی جایا کرتے تھے اس لیے جس دن انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی۔ اور انگریزی فوج کے آدمی شہر کے بندوبست اور مجرموں کی تلاش میں چاروں طرف پھرنے لگے تو نواب صاحب موصوف جان کے خوف سے ننگے سر ننگے پاؤں شہر سے نکل کھڑے ہوئے چند روز درگاہ قدم شریف میں رہے پھر بلم گڈھ میں قیام کیا اور وہاں سے گوالیار چلے گئے اور وہیں انتقال کر گئے لیکن اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ ابھی زندہ ہیں اور میاں نظام الدین صاحب کے ساتھ حیدرآباد

---

[1] سلسلہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گم شدہ ورق کے دونوں صفحوں میں میاں نظام الدین صاحب ہی کا حال ہوگا۔ کیونکہ اس ورق میں بھی وہی سلسلہ ہے۔ حسن نظامی

چلے گئے ہیں خدا جانے سچ ہے یا جھوٹ ۔

(۵) حکیم صادق علی خان کے بیٹے حکیم محمود خان[1] اور حکیم مرتضیٰ خان جو بہت خاندانی آدمی ہیں اور حکیم مرتضیٰ خان مدت سے ریاست پٹیالہ میں اپنے بڑے بھائی غلام محمد خان مرحوم کی جگہ پر مقرر ہیں اور محمود خان اپنے والد کی جگہ مطب کرتے ہیں جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی تو ان دونوں صاحبوں نے لوگوں کے ساتھ بہت ہمدردی کی جن کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ تمام اہل محلہ اقربا و احباب بلا امتیاز امیر و غریب تقریباً پانسو آدمیوں کو اپنے گھر میں رکھا اور جب تک ہنگامہ فرو نہیں ہوا اس وقت تک ان کی ہر طرح خبر گیری اور خاطر مدارات کرتے رہے ایک دن کسی مخبر کے مخبری کرنے پر سب آدمی جو حکیم صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے گرفتار ہو کر کوتوالی چلے گئے حکیم صاحب موصوف بھی ان کے ہمراہ تین دن تک کوتوالی میں مقید رہے اور بڑی جانفشانی سے ان سب کو چھڑایا اور چند روز کے بعد سب کو ساتھ لے کر ریاست پٹیالہ میں چلے گئے ۔

(۶) لالہ چھوٹا مل کے بیٹے لالہ مہیش داس اور لالہ بال مل[2] کے بیٹے لالہ چھنا مل بھی شہر کے سر برآوردہ ساہوکاروں میں ہیں اور بڑے خوش معاملہ اور مخیر لوگوں میں سے ہیں غدر کے زمانہ میں ان بیچاروں کا لاکھوں روپیہ کا سامان باغیوں نے کلکتہ کے راستہ میں لوٹ لیا اور باغی کئی بار ان کی کوٹھی لوٹنے کی غرض سے چڑھ آئے لیکن ان لوگوں نے حکمت عملی سے اپنے آپ کو لوٹنے سے بچا بچا لیا کئی بار مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان نے باغیوں کو مدد دینے سے ان لوگوں سے بزور روپیہ

---

[1] حکیم محمود خان صاحب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم کے والد تھے ۔ حسن نظامی

[2] چاندنی چوک دہلی میں نیل کا کٹرہ ایک محلہ ہے وہاں اس خاندان کے ہندو اب تک خوش حالی سے زندگی بسر کرتے ہیں ۔ حسن نظامی

لینا چاہا لیکن انھوں نے ایک پیسہ نہیں دیا اور آجکل کرکے ٹالتے رہے۔ دوسری عقلمندی انھوں نے یہ کی کہ روز روز کی خبریں دہلی کی اور بادشاہی دربار کی پہاڑی پر انگریزوں کے پاس پہونچاتے رہے اور جب تک دہلی فتح ہوئی انگریزوں کی خیر خواہی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جب دہلی فتح ہوئی توان کی سرکار انگریزی میں بڑی عزت ہوئی یہ لوگ یوں بھی بہت شریف ہیں اور مخلوق کی خدمت خواہ ہندو ہو یا مسلمان بہت کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غریبوں کی دعا کے اثر سے کٹرہ نیل جہاں یہ رہتے ہیں لٹنے سے محفوظ رہا۔ فی الحال کمسریٹ کا عہدہ ان کو ملا ہے۔

(۷) **ننھے جی اور مناجی** پشندار راجہ امید سنگھ مرحوم کے بیٹے بہت عزت دار[۵۱] اور متوسلان شاہی سے ہیں۔ مناجی کو پتنگ بازی کا بہت شوق تھا اور اکثر مریض رہتے تھے غدر میں تانگوں نے ان کا مکان لوٹ لیا۔ چند دن کے بعد طرح طرح کے افکار اور پریشانیوں میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئے۔ دوسرے بھائی ننھے جی بہت ہوشیار اور سمجھدار آدمی ہیں غدر میں یہ بھی برباد ہو گئے لیکن انگریزی عملداری میں اپنی ہوشیاری اور دانائی سے خیر خواہان سرکاری میں داخل ہو گئے۔ دسمبر ۱۸۵۸ء میں پندرہ ہزار تین سو روپے نقصان کے سرکار انگریزی سے وصول کر لیے۔

(۸) نواب مظفر الدولہ حسین مرزا یہ دونوں حقیقی بھائی نواب حسام الدین حیدر

---

[۵۱] ان کے وارثوں کا حال معلوم نہ ہو سکا ممکن ہے آخری ضمیمہ میں درج ہو سکے۔ حسن نظامی

حاشیہ:۔ راجہ بہادر سنگھ خلف راجہ بزلم دار وغہ الملاک شاہ اور جس دن انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی۔ اپنے قدیمی مکان میں جو کابلی دروازہ کے قریب ہے اپنے نوکروں سمیت مسلح ہو کر بیٹھے ہوئے تھے کہ گورہ کی فوج ادھر سے نکلی ان میں سے ایک گوروں نے راجہ صاحب اور ان کے ایک ملازم کو قتل کر دیا۔

ابن آغا شفیع خان کے بیٹے تھے ان میں سے ایک نواب مظفر الدولہ تو گھر میں بیٹھے رہتے تھے دوسرے بھائی حسین مرزا بعہدہ نظارت قلعہ شاہی میں متعین تھے یہ دونوں بھائی بہت خاندانی اور لائق وہوش مند تھے یہ بچارے بھی جان کے ڈر سے مکان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے لیکن مظفر الدولہ تو آلور سے گرفتار ہو کر آ گئے اور گوڑ گانوں میں دوسرے لوگوں کے ساتھ فوٹ صاحب کلکٹر گوڑ گانوں کے حکم سے ان کے گولی ماردی گئی دوسرے بھائی حسین مرزا ناظر مقام برستؔ[1] کو چلے گئے کچھ دن بعد نابینا ہو گئے ان کے دو بیٹے تھے ایک طالع یار خان دوسرے اصغر یار خان یہ دونوں ایسے حسین نوجوان تھے کہ دہلی میں ان کا مثل نہیں تھا جس وقت یہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو لوگ سکتہ کے عالم میں رہ جاتے تھے یہ دونوں بھائی بھی گھنشام چپڑاسی ایجنٹی جے پور اور مسمی سیہدار مخبروں کی مخبری کرنے سے آلور سے بے گناہ گرفتار کر کے لائے گئے ان دونوں بھائیوں نے ہر چند مخبروں کی خوشامد کی لیکن ان ظالموں نے ایک نہ سنی اور ایک سو آٹھ قیدیوں کے ساتھ ان کو بھی دہلی بھیجدیا اور دو مہینہ جیل خانہ کی مصیبت جھیلنے کے بعد بغیر تحقیقات کے بالکل بے گناہ اور بے قصور دونوں کو پھانسی دیدی گئی ان کے پھانسی پانے سے اہل شہر کو سخت رنج وافسوس ہوا ان کے پھانسی پانے کے بعد جو حال ان کے باپ حسین مرزا کا ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ بقیہ عمر روتے ہی رہے ۔۔

(۹) **نواب میر خان** پنشن دار[2] خلف نواب مرتضیٰ خان جاگیردار پلول معہ اپنے

---

[1] برست ضلع کرنال میں شیعوں کا گاؤں ہے ۔ حسن نظامی

[2] نواب اسحٰق خان صاحب مرحوم رئیس جہانگیر آباد وسکرٹری علی گڈھ کالج کے قرابت دار تھے ۔۔ حسن نظامی

نوجوان بیٹے عثمان خان عرف دھولا الور سے گرفتار ہو کر آئے اور اس جرم میں کہ مرزا عبداللہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے پھانسی دی گئی ان کے اہل و عیال حیران پریشان ہو کر جاورہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔

---

(۱۰) **نواب یعقوب علی خان** ابن شجاعت خان جو نواب نجیب خان والی کٹیر کے خاندان سے ہیں اور بہت مسکین طبیعت آدمی ہیں جس دن سے غدر پڑا انھوں نے بھول کر بھی گھر میں سے قدم نہیں نکالا لوگوں نے ان کو بہت ترغیب دی کہ دربار شاہی میں شریک ہوں لیکن انھوں نے بوجہ نمک خواری سرکار انگریزی دربار شاہی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا یہ بچارے بارہ برس سے قرض خواہوں کے اجرائے ڈگری کے ڈر سے گھر میں بیٹھے رہتے تھے چارسو روپے پنشن تھی لیکن بہت کثیر الاولاد تھے ہمیشہ مقروض رہتے تھے جب دن انگریزی فوج داخل ہوئی تو اپنے اہل و عیال اور اسباب سمیت دہلی سے بھاگے قطب صاحب کے راستہ میں ان کو گوجروں نے معہ ان کے بڑے بیٹے قطب علی خان کے قتل کر دیا اور سب مال اسباب لوٹ لے گئے ان کے متعلقین جو باقی رہ گئے ہیں ان کا حال بیان کرنے سے کلیجہ کانپتا ہے ۔

(۱۱) **نواب اکبر خان** ابن فیض اللہ خان بنگش جن کی دوسو پچاس روپے پنشن سرکار سے مقرر تھی اور ایک سو روپے ان کی بیوی کی پنشن تھی بڑے فضول خرچ اور جوتے کے عادی تھے ہمیشہ قرضدار رہتے تھے اور قرض خواہوں کے خوف سے گھر میں بیٹھے رہتے تھے کرایہ وغیرہ کی آمدنی معقول تھی یہ بچارے بھی جو لوگ الور سے گرفتار ہو کر آئے تھے انہی کے ساتھ گرفتار ہو کر آئے اور گوڑگانوں میں ان کو بھی پھانسی دے دی گئی ان کے بیٹے فیض محمد خان عرف بدہن بچ گئے اور ان کے

متعلقین کو لے کر اجمیر شریف چلے گئے معلوم نہیں وہاں کہاں رہتے ہیں ::

---

(۱۲) مسمی **احمد مرزا** خلف محمد حاجی ان کے باپ تو مر چکے تھے لیکن یہ اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے شہر کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ مرزا مغل کے مشیر خاص تھے اور شہزادوں کے پاس بھی ان کی نشست و برخاست تھی چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے یہ بھی الور سے گرفتار ہو کر آئے اور گوڑ گانوں میں مارے گئے ::

(۱۳) مسمی **میر محمد حسین** میر خیراتی سررشتہ دار محکمہ ایجنٹی کے بیٹے بڑے بھاری بھر کم آدمی تھے۔ اور بہت متمول تھے پہلے ریاست آلور میں مرزا اسفندیار بیگ کے علاقہ پر ملازم تھے اکثر بخت خان جرنیل فوج شاہی کی صحبت میں آتے جاتے تھے اور عہدہ پانے کی امید میں قلعہ میں بھی جاتے آتے تھے ان کے کوئی اولاد نہیں تھی روپیہ پیسہ بہت تھا مگر بڑے خسیس تھے الور سے یہ بھی گرفتار ہو کر آئے قریب دو مہینہ کے کوتوالی میں قید رہے بعد میں ان کو بھی پھانسی دیدی گئی

---

(۱۴) **مرزا فاضل بیگ** محمد بیگ کے بیٹے چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے ان کے خاندان کے لوگ صاحب علم تھے اور یہ خود بھی صاحب علم اور بہت صحبت یافتہ آدمی تھے قلعہ میں بہت زیادہ جاتے آتے تھے پہلے مرزا شاہرخ مرحوم کے ملازم ہوئے پھر رسوخ پیدا کر کے **شرافت محل** والدہ مرزا مغل کے مختار اور کارپرداز ہو گئے اور بہت کچھ روپیہ پیدا کر لیا یہ بھی جان کے خوف سے دہلی سے بھاگ گئے ان کا اشتہار گرفتاری جاری ہوا لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں لگا اور یہ گرفتاری سے بچ گئے ان کے چھوٹے بھائی مرزا جان بیگ غدر سے ایک سال پہلے حج کو چلے گئے تھے۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو بمبئی میں واپس آئے

اور وہاں سے کچھ دن قیام کر کے اندور گئے۔ اندور سے ہاملٹن صاحب کی سفارشی چٹھی لکھوا کر دہلی کے حکام کے پاس بھیجی حکام دہلی نے ہملٹن صاحب کی سفارش پر ان کی جائداد وغیرہ واگزاشت کر دی کچھ دنوں بعد یہ خود دہلی آگئے اور عرب سرائے کے قریب رہنا اختیار کیا اور اپنے مقدمات کی پیروی شروع کی۔

(۱۵) **حکیم عبدالحق** ابن حکیم حسن بخش۔ یہ چند سال تک بلم گڈھ کی دیوانی پر مقرر ہوئے جب خوب روپیہ پیدا کر لیا اور بہت مالدار ہو گئے تو ملازمت سے استعفا دے کر اپنے گھر آگئے اور فارغ البالی سے اپنی زندگی بسر کرنے لگے ان کا اکثر سید حامد علی خاں کے یہاں احمد مرزا اور راجہ جے سکھ راؤ کے لڑکوں کی وجہ سے آنا جانا رہتا تھا اس لیئے ان کو پھانسی دی گئی۔

(۱۶) **ایک شخص** قاضی فیض اللہ کشمیری جو اٹھارہ سال تک صدرالصدور کی کچہری میں سررشتہ دار رہے جان پاٹن کمنبس صاحب سشن جج دہلی کے زمانہ میں رشوت ستانی کے الزام میں معزول کئے گئے ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد سوداگری کا سلسلہ کر لیا تھا اور خوب آرام سے۔ ہنگامۂ باغیوں کے دور میں دہلی کے کوتوال ہو گئے جب انگریزی عملداری ہوئی تو ان کو پھانسی دے دی گئی۔

(۱۷) **عبدالحلیم خان** نائب کوتوال نے جو یہ حالت دیکھی تو وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر الور بھاگ گئے پھر الور سے کہیں اور چلے گئے۔ ان کی گرفتاری کے لیئے اشتہار ہو گیا۔ لیکن یہ بہت دنوں تک روپوش رہے۔ جب یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کا مجرموں اور مفسدوں کی معافی کے لیئے اشتہار جاری ہوا تو پھر یہ خود ۲۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ڈپٹی کمشنر دہلی کے پاس حاضر ہو گئے اسوقت تو حوالات کر دیئے گئے لیکن آخر جنوری ۱۸۵۹ء میں چھوڑ دیئے گئے لیکن جائداد ضبط ہو گئی۔

(۱۸) **منشی آغا جان** مدتوں محکمہ ایجنٹی میں محرر رہے انھوں نے بھی خوب روپیہ پیدا کیا پھر استعفا دے دیا یہ بڑے مخیر آدمی تھے صبح شام ان کے ہاں خیرات جاری تھی جب انگریز دلی میں گھس آئے تو یہ بچارے بھی شہر چھوڑ کر بھاگے چند مہینہ پریشان حال پھرتے رہے کبھی اس گاؤں میں کبھی اس گاؤں میں جب بالکل تباہ و برباد ہو گئے تو حضرت سلطان جی میں آکر قیام کیا کسی نے مخبری کر دی کہ یہ تو جہادیوں کو کھانا وغیرہ کھلاتے تھے آخر بچارے گرفتار ہو گئے کچھ دنوں کوتوالی میں قید رہے لیکن پھر چھوڑ دیئے گئے۔

---

(۱۹) **صفدر سلطان** ابن نواب مرزا بخشی محمود خان مرحوم کے نواسے تھے اور خود بھی بخشی تھے جب تک بادشاہ دہلی میں رہے یہ اپنے عہدہ پر قائم رہے لیکن پھر یہ بھی بھاگے بہت دنوں تک ان کا پتہ نہیں چلا اب نواب رامپور کے پاس اپنی سفارش کے لیئے گئے ہیں۔

---

(۲۰) **ایک شخص** میاں امیر صاحب خوشنویس[۱] بہت طاقتور اور لمبے تڑنگے آدمی تھے چرانوے برس کی عمر تھی مگر پنجہ میں بڑی طاقت تھی بے مثل خوشنویس تھے اور اپنے زمانہ کے کامل الفن استاد سمجھے جاتے تھے انگریزی فوج کے ایک سپاہی کی گولی سے شہید ہو گئے۔

---

(۲۱) **مولانا مولوی صدرالدین خان** ۵۰ سال سے انگریزوں کے ملازم تھے۔

---

[۱] میر پنجہ کش کے نام سے دہلی میں مشہور ہیں ان کی اولاد موجود ہے جامع مسجد کے قریب آباد ہے۔ حسن نظامی

بڑے بڑے عہدوں پر رہے اب پچیس سال سے دہلی کے صدر الصدور تھے۔
بڑے ایمان دار حاکم تھے اہل مقدمہ ہمیشہ ان کے انصاف سے خوش رہتے تھے۔
سرکار انگریزی کے بہت خیر خواہ تھے جب غدر میں کچہریاں اور دفتر جلا کر خاک
سیاہ کر دیئے گئے تو یہ بھی گھر میں بیٹھ رہے پھر بادشاہ کے بلانے سے مجبور
ہو کر جبراً قہراً قلعہ میں عدالت کا کام کرنے لگے انگریزوں کے قتل کے فتوے پر
انھوں نے بھی باغیوں کے جبر سے مہر لگا دی جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو یہ
بھی اسی جرم میں گرفتار ہو گئے لیکن چونکہ پہلے بڑی نیک نامی اور دیانت سے
ملازمت کر چکے تھے لہٰذا سابقہ کارگزاریوں کے باعث چند مہینہ نظربند رہ کر رہا
ہو گئے۔ پھر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں ایک مختصر مکان لیکر وہیں رہنے لگے۔

---

(۲۲) حافظ داؤد قلعہ میں معلم تھے پھر لکھنؤ چلے گئے ان کی میڈ ہڈ صاحب
رسالدار سے بہت قریبی رشتہ داری تھی اس وجہ سے وہاں بہت کچھ روپیہ
پیسہ پیدا کر کے دہلی چلے آئے اور یہاں امیرانہ طریقہ سے رہتے تھے۔ یہ بھی
گرفتار ہو کر کوتوالی میں بند کئے گئے لیکن ایک ہزار کی ضمانت پر رہا ہو گئے۔

---

(۲۳) نواب سید حامد علی خان رئیس برشتہ یہ میر فضل علی خان نائب شاہ
اودھ کے داماد تھے جب ان کے خسر کا انتقال ہو گیا تو ان کی بیوی کو اپنے
باپ کے ترکہ سے نولاکھ روپیہ نقد اور بہت سامان ملا سید حامد علی خان نے
وہ روپیہ سرکاری خزانہ میں جمع کر دیا جس میں سو ساڑھے چار ہزار روپے
ماہوار ملتا تھا لیکن چند سال سے فضول خرچیوں میں سب روپیہ برباد کر دیا
پھر حسین بخش سوداگر کے مشورہ سے دہلی کے قلعہ میں داخل ہو کر نائب مقرر ہوئے

اور بادشاہ کو خوب لوٹا پھر لکھنؤ چلے گئے وہاں قید کر لیئے گئے جو کچھ روپیہ باقی تھا وہ پرگنہ برارج اور گونڈہ کی بقایا میں دے دیا وہاں سے رہائی پا کر پھر دہلی چلے آئے یہاں راجہ دیبی سنگہ سالگ رام احمد مرزا جان اور مرزا فاضل بیگ حکیم عبدالحق اور میر تفضل حسین وکیل کی صحبت میں رہنے لگے غدر کے زمانہ میں مرزا مغل اور مرزا ابوبکر کے پاس بہت آتے جاتے تھے اس لیئے یہ بھی برست سے گرفتار ہو کر آئے ان کے ساتھ ان کے ہم زلف میر حیدر حسن خان کے تین لڑکے سردار مرزا۔ عباس مرزا اور وزیر مرزا بھی کوتوالی دہلی میں مقید رہے ان میں سے سردار مرزا اخیر ماہ اپریل ۱۸۵۸ء میں چھوٹ گئے اور نواب حامد علی خان فروری ۱۸۵۹ء میں چودہ مہینہ حوالات میں رہ کر دو سو روپے کی ضمانت پر رہا ہوئے قید سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے شہر سے باہر ایک مکان لے کر سکونت اختیار کی۔

---

(۲۴) **نواب احمد قلی خان** نواب عباس قلی خان مرحوم کے بیٹے تھے ان کی بیٹی نواب زینت محل بیگم بادشاہ کی بیگم تھیں بادشاہ کے خسر تھے اور بہت نامور لوگوں میں سے تھے جس دن انگریز دلی میں داخل ہوئے ہیں تو یہ بھی بھاگے لیکن جھجر سے پکڑے ہوئے آئے ان سے بڑھاپے کی وجہ سے قید کی سختیاں برداشت نہ ہو سکیں آخر جیل خانہ ہی میں انتقال ہو گیا۔

---

(۲۵) **نواب محمد حسین خان** خلف نواب ارتضیٰ خان مرحوم۔ ان کی کلکٹری سے دو سو روپے پنشن تھی عیش و آرام سے بسر کرتے تھے صحبت خراب تھی اکثر شرابیوں جواریوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے اسی وجہ سے بہت قرضدار رہتے تھے۔

غدر میں مرزا خضر سلطان کے نائب ہو گئے تھے اسی جرم میں جھجر سے گرفتار ہو کر کچھ عرصہ قید رہے اور پھر پھانسی دے دی گئی۔ یہ بچارے کثیر الاولاد تھے ان کے بعد ان کے متعلقین بہت تباہ و پریشان پھرتے ہیں۔

---

(۲۶) حکیم شرف الدین خان مرحوم کے نوجوان بیٹے نظام الدین خان اور استاد ذوق کے بیٹے خلیفہ اسمٰعیل چند دوستوں کے ساتھ قدم شریف سے گرفتار کر لیئے گئے ایک رات کوتوالی میں رہے دوسرے دن بالکل بے قصور اور بے گناہ پھانسی دے دی گئی حالانکہ ان پر کوئی ثبوت نہ تھا ہر شخص ان کی بیگناہی کا رنج کرتا تھا۔

---

(۲۷) مرزا معین الدین[۵۱] حسن خان، پہاڑ گنج کے تھانہ دار تھے ان کے چھوٹے بھائی محمد حسین خان بدر پور کے تھانہ دار تھے یہ دونوں بھائی تین دن بلوہ کے زمانہ میں شہر کی کوتوالی پر مامور رہے پھر مرزا مغل کے نائب ہو گئے اکثر معرکوں میں باغیوں کی طرف سے شریک بھی ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر بار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیئے ٹونک کی طرف چلے گئے۔

---

(۲۸) لالہ رام جیداس گڑوالے[۵۲] بہت خلیق اور وضعدار آدمی تھے ساہوکارہ میں ان کی بڑی عزت تھی کاروبار بھی ان کا خوب چلتا تھا بڑے نازک نحیف الجثہ

---

[۵۱] نواب قدرت اللہ بیگ خان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کو نواب سالار جنگ نے حیدر آباد دکن میں نوکری دے دی تھی۔ حسن نظامی

[۵۲] ان کی اولاد اب بھی دہلی میں معزز سمجھی جاتی ہے حسن نظامی

اکثر مریض رہتے تھے سرکار انگریزی میں بھی ان کی بہت عزت تھی بلوہ کے زمانے میں یہ بھی مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کے ہاتھوں بہت پریشان رہے۔ جب انگریزی عملداری ہوئی تو یہ بھی اور ساہوکاروں کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلے گئے لیکن سفر اور پریشانی کے متحمل نہ ہوئے اور مر گئے ان کے بعد ان کے بیٹے نرائن داس ان کی گدی پر بیٹھے یہ بھی اپنے باپ کے قدم بقدم چلتے ہیں ان کی ایمانداری کی ایک مثال تو یہ ہے کہ نواب محبوب علی خان کا بیالیس ہزار روپیہ ان کی کوٹھی میں جمع تھا اور انگریزوں کو بیس ہزار روپے کا سراغ ملا جب لارنس صاحب چیف کمشنر دہلی میں آئے اور ان سے روپے کے بارہ میں سوال کیا گیا تو انھوں نے بیالیس ہزار کا اقرار کیا ان کی سچائی سے انگریز بہت خوش ہوئے اور ان کو کرسی دی گئی۔

---

(۲۹) ضیاء الدولہ خلف حکیم رکن الدولہ[1] بہت امیر کبیر تھے ان کی آمدنی دوکانوں اور باغات وغیرہ کی قریب چار سو روپے کے تھی امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے جب گورے دہلی میں گھسے تو یہ بھی دہلی چھوڑ کر بھاگے مگر راستہ میں ان کا سب مال اسباب گوجروں نے اور انگریزی سپاہیوں نے لوٹ لیا۔ یہ بچارے صرف جان بچا کر معہ چند عورتوں بچوں کے پانی پت چلے گئے کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے گرفتار ہو کر آئے لیکن بے قصور سمجھ کر سو روپے کی ضمانت پر چھوڑ دیئے گئے اور اپنے موروثی مکان میں رہنے لگے۔

---

[1] ان کے ورثا حیدر آباد میں نوکر ہے اور اب بھی ہیں۔ اور ان کی قبریں درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں میرے مکان کے برابر واقع ہیں۔ حسن نظامی

(۲۳۰) **موسیٰ خان** ابن حافظ عبدالرحمٰن خان مرزا ایلی مرحوم کے ہاں مختار تھے یہ بھی[ف۱] مالدار تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ وغیرہ کی آمدنی تھی الور سے گرفتار کر کے لائے گئے قریب تین مہینہ کے کوتوالی میں حوالات رہے پھر پانسو روپے کی ضمانت پر رہا ہوئے ان کی جائداد وغیرہ ضبط ہو گئی اسی پر ان کی گزر بسر تھی اب بھوجلا پہاڑی پر ایک شخص کے مکان میں رہتے ہیں۔

---

(۲۳۱) **نواب نبی بخش خان** بھی نامور لوگوں میں سے[ف۲] ہیں انھوں نے نمک حرام تلنگوں کے عہد میں بادشاہ کو ایک عرضی اس مضمون کی لکھی تھی کہ ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کا قتل ممنوع ہے اور بھی کسی مذہب میں جائز نہیں ہے اگر حضور میموں اور ناکردہ گناہ بچوں کے قتل سے باغیوں کو روکیں تو یہ بات حضور کے حق میں دنیا اور عقبیٰ میں بہتر ہوگی جب دہلی فتح ہوئی تو اتفاق سے یہ عرضی دفتر سے برآمد ہوئی اس صلہ میں نواب صاحب کو پانسو روپیہ انعام ملے اور سرکاری خیر خواہوں میں ان کا شمار ہو گیا۔

---

(۲۳۲) **نواب ارتضیٰ خان** خلف نواب مرتضیٰ خان مرحوم جاگیردار پرگنہ پلول پہلے بہت بدچلن آدمی تھے کوئی پندرہ برس سے حکیم نورالدین صاحب کی صحبت نے ان پر ایسا اثر کیا کہ ان کی عادتیں بالکل بدل گئیں۔ بڑے نمازی اور پرہیزگار ہو گئے غدر کے زمانہ میں یہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ جو انگریزی فوج میں ملازم تھے دہلی سے چلے کچھ دن انہیں سواروں کے ساتھ پھرتے رہے پھر میرٹھ چلے گئے اور وہیں

[ف۱] ان کے بیٹے کا نام احمد حسین خان تھا نواب کلب علی خان نے تیس روپے ماہوار مقرر کر دیئے تھے۔

[ف۲] دریبہ میں انہی کی مسجد ہے۔ ان کی اولاد اب بھی دہلی میں ہے۔　حسن نظامی

سکونت اختیار کر لی ۔۔

---

(۳۳) **محمد علی خان** خلف نواب شیر جنگ خان چھیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے بہت خوبصورت جوان تھے چار سو روپے کی آمدنی نواب بہادر جنگ خان کے پرگنہ سے تھی خوب عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے جب انگریز شہر میں گھسے تو یہ گھر میں ہی رہے آخر بندوق کی گولی سے شہید ہو گئے ۔۔

---

(۳۴) **عبدالصمد خان** ابن علی محمد خان بادشاہ کی فوج میں رسالدار تھے یہاں سے ملازمت چھوڑ کر واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے وہاں کسی پلٹن کے افسر ہو گئے جب اودھ کی سلطنت متزلزل ہوئی تو یہ پھر دہلی چلے آئے کچھ دن بعد ممن چابک سوار کے ساتھ الور چلے گئے اور وہاں ملازمت کر لی دہلی فتح ہونے سے چند دن پہلے بچارے دہلی آئے تھے خود کیا آئے تھے قضا لائی تھی عبدالرحمن خان والی جھجر کے خسر کے شبہ میں گرفتار کر لیئے گئے کیونکہ ان کا نام بھی صمد خان تھا اور اسی شبہ میں گولی ماردی گئی ۔ ان کے بعد ان کے باپ اور ان کے چچا بھی انہیں کے غم میں جلد ہی انتقال کر گئے ۔۔

---

(۳۵) **نواب جھجر** کے خسر عبدالصمد خان ڈھائی سو سوار لے کر بادشاہ کی مدد کے واسطے آئے تھے اور برابر شاہی فوج کے ساتھ ملکر انگریزوں سے لڑتے رہے جب "تلنگے بھاگے تو یہ بھی ان کے ساتھ بھاگے ۔ ان کے ساتھ ایک بہت بڑا گروہ ہے اور اب ڈکیتی کرتے پھرتے ہیں ۔۔

---

(۲۳۶) **حکیم امام الدین خان** ولد حکیم غلام رضا خان حکمت میں اپنے وقت کے شیخ مانے جاتے ہیں اکبر شاہ کے عہد میں شاہی طبیب تھے پانسو روپے ملتے تھے بہادر شاہ کے زمانہ میں سو روپے پاتے تھے نواب زینت محل کے معالج تھے غدر کے زمانے میں گھر میں بیٹھے رہے جب سب لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے تو یہ بھی دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ چند روز بعد برن صاحب بہادر کے حکم سے اپنے مکان میں رہنے لگے لیکن پھر جان مٹکاف صاحب کے حکم سے شہر بدر کر دیئے گئے اور قطب صاحب میں رہنے لگے۔ پھر جمتی پرشاد کی سرکار میں ملازم ہو گئے کچھ دن بعد بنارس سے چلے آئے۔ پھر والی ٹونک کی طلبی پر ستمبر ۱۸۶۸ء میں ٹونک چلے گئے۔

---

(۲۳۷) **نواب حسن علی خان** کے والد نواب نجابت علی خان والی جھجر کا جب انتقال ہوگیا تو ان کے بڑے بھائی نواب فیض محمد صاحب گدی نشین ہوئے ان کے زمانے میں یہ جرنیل تھے۔ جب ان کے بھائی نواب فیض محمد خان کا بھی انتقال ہو گیا تو نواب فیض علی خان گدی پر بیٹھے ان سے ان کی کچھ ان بن ہو گئی یہاں تک کہ مقدمہ بازی کی نوبت پہونچی آخر گورنمنٹ انگریزی کے حکم سے ریاست سے ان کے تین ہزار روپے مقرر ہو گئے جو محکمہ ایجنٹی سے مل جایا کرتے تھے اس کے بعد یہ دہلی چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی غدر کے زمانے میں بادشاہ کی خدمت میں ظاہری چاپلوسی کی وجہ سے اکثر آتے جاتے تھے جب انگریزی عملداری ہوئی تو یہ بیچارے سب مال و اسباب چھوڑ کر تن تنہا بھاگے اور خدا جانے کس طرف چل دیئے ان کے متعلقین ان کے بعد تباہی و بربادی کے عالم میں گاؤں گاؤں پریشان پھرتے ہیں ان کے بڑے بیٹے سعادت علی خان بلند شہر سے گرفتار

---

[1] غالباً راجہ بنارس کا نام ہو گا کتاب میں اس سے زائد کچھ تفصیل نہیں ہے حسن نظامی

ہوکر آئے۔ چند روز قید رہے دو ماہ کے بعد رہائی پاکر جاورہ چلے گئے اور وہیں
بعارضہ قولنج انتقال کر گئے نواب حسن علی خان بھی یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو دہلی آ گئے
اور کمشنر صاحب کے حکم سے کلاں محل میں رہنے لگے۔

---

(۳۸) **دلدار علی خان** کپتان ساکن دہلی اور میر نواب نائب کپتان رسالدار دوہ
نے جب دیکھا کہ تلنگے بھاگ نکلے تو یہ دونوں بھی بھاگ گئے۔ میر نواب گرفتار
ہو کر آ گئے لیکن ان کے خسر کمپنی کے فیل خانہ کے دارو غہ تھے ان کی سفارش سے
یہ چھوٹ گئے اور پھر اپنے وطن چلے گئے دلدار علی خان کی گرفتاری کے لیے
اشتہار ہو گیا کچھ عرصہ بعد پانی پت سے گرفتار کر کے لائے گئے۔ ۷ار جون
۱۸۵۸ء کو پھانسی ہو گئی۔

---

(۳۹) **میاں حسن عسکری** ایک صوفی شاہ سلیمان صاحب کے خاص مریدوں
میں تھے جب اپنے پیر کے پاس سے کشف و کرامت حاصل کر کے دہلی آئے تو یہاں
بہت مشہور ہو گئے۔ پہلے مرزا سلیم بہادر کے بڑے بیٹے مرزا زمان شاہ کی
بیوی کو مرید کیا اور کچھ دن بعد ان کے ساتھ نکاح کر لیا اس دن سے ان کے
مریدان سے پھر گئے لیکن پیر صاحب نے رفتہ رفتہ بادشاہ کو اپنا معتقد بنا
لیا بادشاہ اس درجہ اپنے بھولے پن سے ان کے معتقد ہو گئے کہ روزانہ صبح
کو یہ اپنا لعاب دہن بادشاہ کے منہ میں لگاتے تھے۔ غدر کے ہنگامہ میں نجف خان
جرنیل ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے دو کمبل اور ایک تلوار بطور تبرک
نجف خان کو دی اور ایک خط بھی کسی امیر کے نام فوج کی فراہمی کے لیے لکھا تھا اس
جرم میں پندرہ شوال ۱۲۷۴ھ کو ہفتہ کے دن ان کو پھانسی دے دی گئی۔

(۴۰) **غلام محمد خان** نواب احمد علی خان رئیس فرخ نگر کے چچا اپنے بڑے بھائی نواب مظفر خان کی گدی نشینی کے زمانہ میں نائب تھے۔ جب نواب مظفر علی خان کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے یعقوب علی خان اپنے باپ کی جگہ گدی پر بیٹھے غلام محمد صاحب سے اور یعقوب علی خان سے تکرار ہوگئی بات یہاں تک بڑھی کہ گورنری اور ایجنٹی سے یعقوب علی خان کے ایما سے ان کو دہلی قیام کرنے کا حکم ملا اور تیرہ سو روپے سال ریاست سے ان کا وظیفہ مقرر ہوگیا۔ چند سال کے بعد یعقوب علی خان کا دنیل کے مرض میں انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد احمد علی خان ان کے چھوٹے بھائی ان کی جگہ گدی پر بیٹھے ان سے ان کی رنجش رہی لیکن غدر کے زمانہ میں غلام محمد صاحب اہل وعیال سمیت احمد علی خان کی رضامندی سے فرخ نگر چلے گئے۔ ایک مرتبہ احمد علی خان کی طرف سے کچھ روپیہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں دہلی آئے تھے اس کے بعد پھر فرخ نگر لوٹ گئے۔ جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو ۳۱ اکتوبر کو احمد علی خان رئیس فرخ نگر کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ وہ پہاڑی پر نہیں آئے تھے اور بادشاہ کے ساتھ ساز باز رکھتے تھے۔ ان کا سب علاقہ ضبط کر لیا گیا تھوڑے دن بعد ان کو بھی پھانسی دے دی۔ غلام محمد خان اس دن سے بھاگے رہے لیکن ستمبر ۱۸۵۸ء میں ٹونک سے گرفتار کر کے لائے گئے اور کوتوالی میں قید کر دیئے گئے۔

---

(۴۱) **نواب عبدالرحمٰن خان** رئیس جھجر کے چچا نواب علی محمد خان ان کے والد کا نام نواب فیض محمد خان تھا نواب عبدالرحمٰن خان بہت قابل لوگوں میں تھے انگریزی عربی فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے جھجر میں ہمیشہ پرانی چھاؤنی میں رہتے تھے ان کو خفقان کا عارضہ تھا علاج کے لیئے کبھی کبھی دہلی آیا کرتے تھے۔

انہوں نے ایام غدر میں بادشاہ یا فوج سے کچھ واسطہ نہ رکھا لیکن نواب عبدالرحمن خاں کی گرفتاری کے دن یہ بیچارے بھی روپوش ہو گئے پھر ان کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں چلے گئے۔

(۴۲) **راجہ اجیت سنگھ**۔ راجہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ کے چچا تھے۔ یہ پچیس ۲۵ سال سے دہلی ہی میں رہتے تھے۔ باغیوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ راجہ پٹیالہ کے چچا ہیں ضرور انگریزوں سے ساز باز رکھتے ہوں گے۔ ان کا سب مال اسباب لوٹ لیا اور اُن کو گرفتار کرکے قتل کرنے کے واسطے بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ بادشاہ نے ان کی بے جُرمی اور عالی خاندانی کا خیال کرکے باغیوں کے ہاتھ سے بچا لیا اور دیوان خاص میں رہنے کو جگہ دے دی۔ جب باغی بھاگے اور انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو یہ غازی آباد چلے گئے۔ کچھ روز بعد انگریزوں کی اجازت سے دہلی چلے آئے۔ اور پھر یہاں سے اپنے وطن پٹیالہ کو چلے گئے +

(۴۳) **مولوی محمد نذیر حسین صاحب** اور مولوی عبدالرب صاحب اور مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب نے غدر میں ایک دو میموں اور بچوں کو اپنے گھر میں چھپایا تھا اس صلہ میں ان کو انگریزوں نے انعام دیا اور ان کی خیر خواہی کی قدر کی +

(۴۴) **مرزا اسداللہ خان** غالب عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کرکے لے گئے اور کرنیل برن صاحب کے سامنے لے جا کر ان کو پیش کیا۔ مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی۔ ان کے ایک دوست اتفاق سے اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی سفارش کرکے رہائی دلوا دی ان کا کمپنی بہادر سے ساٹھ روپے مہینہ بطور پنشن مقرر ہے لیکن اس میں ان کی گزر بدقت ہوتی ہے۔ ہمیشہ تنگدست رہتے ہیں +

(۴۵) **نواب علی بخش خان** کے بڑے لڑکے غلام فخرالدین خان انگریزی عملداری میں کوٹ قاسم کے تحصیلدار تھے۔ اشرف خان اور حیدر شاہ خان مخبروں کے

ساتھ جے پور اور الور سے ۱۰ مئی ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی کے حکم سے دوشنبہ کے دن الور کی فوج کی حراست میں دہلی لائے گئے۔ اور کوتوالی میں اور قیدیوں کے ساتھ ان کو بند کر دیا گیا۔ حیدر شاہ خاں اور اشرف خاں نے صرف خیر خواہی کے لئے ایک سو سات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کرا کر دہلی بھیجا تھا جن میں سے آدھے لوگ تو گوڑگانوں میں قتل کر دیئے گئے اور باقیوں کو دہلی میں پھانسی ہوئی۔ انہوں نے سینکڑوں بے گناہوں کا خون اپنی گردن پر لیا ہے۔ غلام محمد فخر الدین خاں صاحب تو ۱۱ اگست ۱۸۵۸ء کو رہا ہو گئے ور جھوٹے مخبر دونو مجرم قرار پائے۔ آخر مخبر ضمانت دے کر چھوٹے۔

بعض اشخاص کے

نئے حالات

اس کتاب میں جن اشخاص کا ذکر آیا ہے اُن میں سے بعض اشخاص کی پوری حقیقت معلوم کرنے کے لئے میں نے چھ سات مہینے اس کتاب کی اشاعت کو روکے رکھا۔ حالانکہ کتاب کی کاپیاں چھاپہ خانہ میں جا کر چھپ بھی گئی تھیں۔

بہت تلاش و جستجو کے بعد جب مجھے کامیابی نہ ہوئی تو ایک دن نواب مصلح الدین صاحب سے ملاقات ہو گئی جو نواب مسعود جنگ بہادر یعنی سیّد راس مسعود صاحب نبیرہ آنریبل سر سید احمد خان بہادر مرحوم کے حقیقی ماموں ہیں اور میں نے ان سے اشخاص مذکور کا ذکر کیا۔ کیونکہ نواب مصلح الدین صاحب دہلی میں ایک زندہ تاریخ ہیں۔ ان کو دہلی اور اہل دہلی کے حالات ایسی تفصیل سے معلوم ہیں کہ غالباً ان کے سوا اور کسی کو معلوم نہ ہوں گے۔ اور میں نے

ہمیشہ معلومات کی مشکل کے وقت ان ہی سے مدد لی ہے۔

انہوں نے اس کتاب کے اشخاص کی پوری اور مشرح حقیقت بیان کردی مگر اس حقیقت میں بعض باتیں ایسی بھی تھیں جنکو نہ نواب صاحب شائع کرنے کے قابل تصور کرتے تھے نہ میں ان کی اشاعت مناسب سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے ان تمام حالات کا خلاصہ کردیا تاکہ ناظرین کے لئے ضروری معلومات مہیا ہوجائے اور کسی کو اپنے بزرگوں کے ناقابلِ اظہار حالات کی اشاعت سے رنج بھی نہ ہونے پائے۔

یہ حالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن موجودہ اور آیندہ نسل کے لوگوں کو ان سے چند چیزیں بالکل نئی معلوم ہوجائیں گی۔ "حسن نظامی"

منشی موہن لال آغا حسن جان صاحب ۔ منشی موہن لال صاحب عرف آغا حسن جان کے حالات معلوم کرنے کا مجھے بہت خیال تھا۔ میں نے کئی دوستوں کو لکھا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ آخر نواب مصلح الدین صاحب سے اُن کی حقیقت معلوم ہوئی۔

منشی موہن لال عرف آغا حسن جان کا اس کتاب میں کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ وہ ذات کے برہمن تھے اور غالباً کشمیری برہمن ہونگے کیونکہ اُن کی موجودہ اولاد بہت خوبصورت ہے۔ ان کے صاحبزادہ صاحب بھی زندہ ہیں جو اب درویش ہوگئے ہیں اور اُن کے پوتے سے میری بہت دوستی ہے اور وہ اُردو زبان کے خاص ادیبوں میں ہیں۔

نواب مصلح الدین صاحب نے فرمایا منشی موہن لال مسلمان ہوگئے تھے۔ اُنکا نام آغا حسن جان رکھا گیا اور وہ انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت میں شریک ہوکر کابل گئے اور نہایت عمدگی کے ساتھ سرکاری خدمات انجام دیں۔ امیر دوست محمد خان شاہ کابل کی گرفتاری بھی انہی کے دورِ ملازمت میں ہوئی تھی۔

آغا حسن جان صاحب کی صاحبزادی کا عقد خان بہادر ڈپٹی اکرام اللہ خان مرحوم سے ہوا تھا جو دہلی کے مشہور رئیس تھے اور سرکی والوں کے محلّہ میں رہتے تھے۔

محبوب علی خاں صاحب - بہادر شاہ بادشاہ کے وزیر بھی ہو گئے تھے - بہت دولتمند تھے یہ وہ بھی کالیں دین بھی کرتے تھے - ایک دفعہ بہادر شاہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رضی میں آئے تو محبوب علی خاں بھی ساتھ تھے - میرے پرنانا میر غلام حسین صاحب سے بہادر شاہ کی بہت بے تکلفانہ باتیں ہوا کرتی تھیں - انہوں نے بہادر شاہ سے کہا - میاں سراج الدین (بہادر شاہ کا نام تھا) تمکو معلوم ہے کہ مغلیہ سلطنت میں زوال کیوں آیا؟ - بہادر شاہ بولتے کم تھے - انہوں نے اشارہ سے ہوں کرکے پوچھا - بتاؤ کیا سبب ہے؟ پرنانا نے کہا جب تمہارے وزیر سود خوار بنیئے ہونے لگے تو سلطنت کا اللہ بیلی ہے -

بہادر شاہ یہ فقرہ سن کر مسکرانے لگے اور انہوں نے مڑ کر محبوب علی خاں کو دیکھا - محبوب علی خاں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی حضور! میری خطا یہ ہے کہ اس درگاہ کے نام پانچ روپے روز مقرر تھے - وہ بعض حالات کے سبب بند کر دیے گئے ہیں اور پیرزادہ صاحب اسکی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں - بادشاہ نے کہا بھئی اماں (یہ بادشاہ کا تکیہ کلام تھا) یومیہ جاری کر دو - یہ بری بات ہے - کہ درگاہوں کا خرچ بند کیا جائے -

محبوب علی خاں صاحب کی اولاد میں اب بھی ایک صاحب تارا چند کے کوچہ میں رہتے ہیں اور نقشہ نویسی کا کام کرتے ہیں -

مدرسہ دار البقاء - یہ مدرسہ جامع مسجد کے جنوبی گوشہ میں تھا جہاں آجکل سنگھاڑا بنا ہوا ہے - اور اس میں ایک کنواں بھی ہے اور جس کے قریب سڑک کے پاس کباڑیوں کی دکانیں اور حکیم نابینا صاحب کا مطب ہے -

یہ مدرسہ بہت مشہور اور بہت آباد تھا - دور دور سے طلبا یہاں پڑھنے آتے تھے اور رات دن اہل علم کا یہاں ہجوم رہتا تھا -

ملا نظام الدین صاحب - انکا عرف شاہ جی تھا - دہلی میں شاہ جی کا تالاب شاہ جی کا چھتہ انہی کے نام سے اب تک مشہور ہے - یہ مرہٹوں کے صوبہ دار اور بہت لائق اور منتظم عہدہ دار تھے - چپاوڑی بازار - چپاوڑی مرہٹی میں کو توالی کو کہتے ہیں - مرہٹہ گردی میں یہاں مرہٹوں کی

کوتوالی تھی اور اب اس بازار میں مطبع انقلاب آباد ہیں۔ دہلی کے ایک شاعر مولانا راسخ نے لکھا ہے ؎

چاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ جمگھٹے حوروں کے پریوں کے پرے رہتے ہیں

نواب غلام محی الدین خان عرف بڈھن صاحب ۔ انکے والد نواب امیر خاں تھے۔ اور دادا مُلّا نظام الدین صاحب عرف شاہ جی تھے۔ جن کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔

میاں نظام الدین صاحب ۔ یہ حضرت مُلّا نظام الدینؒ اورنگ آبادی کی اولاد میں تھے حضرت مُلّا نظام الدینؒ کاکوری ضلع لکھنؤ کے شیوخ میں تھے۔ بڑے عالم اور بڑے درویش تھے۔ اورنگ آباد دکن میں انکا مزار ہے اور حضور نظام کی طرف سے چالیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر بھی اس درگاہ کے لئے وقف ہے۔ انکو حضرت خواجہ نظام الدینؒ اورنگ آبادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کے فرزند حضرت مولانا فخر الدینؒ دہلوی تھے۔ جنہوں نے آخر زمانہ میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کو بہت فروغ دیا حضرت مولانا نیاز بریلوی اور حضرت مولانا نور محمدؒ مہاروی انہی کے خلفاء میں تھے۔ حضرت مولانا فخر صاحبؒ کے صاحبزادہ میاں قطب الدین صاحبؒ ہوئے۔ انکے فرزند میاں نصیر الدین کالے صاحبؒ ہوئے۔ اور اُنکے فرزند میاں نظام الدین صاحبؒ ہوئے۔ اورنگ آباد اور حیدرآباد میں بھی اس خاندان کے لوگ موجود ہیں اور دہلی میں بھی کوچہ پنڈت میں پیرجی میاں عبدالصمد صاحب اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

لالہ چھنامل صاحب ۔ انکی اولاد میں لالہ رادھے موہن صاحب گدی پر ہیں۔ یہ کھتری ہیں اور بڑے صاحب جائداد ہیں۔ انکی کوٹھی کا نام چھنامل سالگ رام ہے۔ یہ خاندان چاندنی چوک کٹرہ نیل میں آباد ہے۔

نواب اکبر خاں ۔ یہ نواب امیر خاں کے فوجی سرداروں میں تھے۔ نواب امیر خاں نے ٹونک کی ریاست حاصل کی تھی جو اپنے زمانہ میں بہت مشہور تھے اور یہ اُنکے خاص آدمیوں میں تھے۔

میر محمد حسین صاحب عرف میر خیراتی ۔ انکی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ لڑکی کی اولاد پنڈت کے کوچہ میں موجود ہے۔ مودودی خاندان کے اکثر افراد اسی نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔

مرزا فاضل بیگ صاحب ۔ انبیاء کی گلی کوچہ چیلان میں رہتے تھے ۔ انکے خاندان میں میرزا بیگ صاحب بیدل سررشتہ تعلیم لاہور میں بھی ملازم تھے ۔ ان کے اجداد کے مزارات ہمارے ہاں درگاہ میں ہیں ۔

حکیم عبدالحق صاحب ۔ انکی حویلی دہلی دروازہ کے قریب تھی جس پر آج کل کٹرہ پائی والا لکھا ہوا ہے اور جو خان بہادر حاجی محمد یوسف پائی والوں کے قبضہ میں ہے ۔

قاضی فیض اللہ صاحب کشمیری ۔ حمید منزل دریا گنج میں ایک مشہور حویلی ہے وہ انہی کی ملکیت میں تھی ۔ غدر میں باغیوں نے عیسائیوں کو گرفتار کر لیا تھا ۔ ان عیسائیوں میں ان کے بھی کچھ دوست تھے ۔ انکو رہا کرانے کی مصلحت سے شاہی کوتوالی میں نوکر ہو گئے تھے ۔ انگریزوں کا تسلط ہوا تو شبہ میں ان کو بھی پھانسی دے دی گئی ۔

منشی آغا جان صاحب ۔ مفتی صدرالدین صاحب کو ان کی بہن بیاہی ہوئی تھیں نواب کرم اللہ خاں صاحب عرف ننھے خاں صاحب مرحوم انہی کے صاحبزادہ تھے ۔ جن کے مکانات مٹیا محل میں ہیں ۔

مفتی صدرالدین خاں صاحب ۔ آغا عنایت الرحمن خاں صاحب اور آغا احسان الرحمن خاں صاحب مفتی صاحب کے بھانجے تھے ۔ کوئی اولاد مفتی صاحب کے نہ تھی ۔ ان کے بھانجوں کی اولاد اب بھی دہلی میں موجود ہے ۔ نواب ابوالحسن خاں صاحب بی ۔ اے فرسٹ کلاس مجسٹریٹ دہلی مفتی صاحب کے بھانجہ کی اولاد ہیں ۔

مفتی صاحب کے والد نواب عبدالرحمن خاں صاحب لارڈ لیک کو مرہٹوں کے مقابلہ کے لئے لائے تھے اور تاریخ دہلی میں ان کا ایک خاص حصہ ہے ۔

حافظ داؤد صاحب ۔ دہلی کے چاوڑی بازار میں ان کے نام کا کمرہ اب تک موجود ہے ۔ جو نواب صاحب دوجانہ کے قبضہ میں ہے ۔ درگاہ قطب صاحبؒ میں ان کی باؤلی بھی مشہور ہے ۔

نواب سیّد حامد علی خاں صاحب - ان کا خاندان کشمیری دروازہ دہلی میں آباد ہے۔ دہلی کا مشہور عربک کالج انہی کی امداد سے چل رہا ہے۔ انہوں نے ایک لاکھ ستّر ہزار روپے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وقف کئے تھے۔ یہ آغا میر وزیر شاہ اودھ کی معزولی کے بعد شاہ اودھ کے وزیر ہو گئے تھے۔

میرزا معین الدّین حسن خاں - نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ غدر کے بعد حیدرآباد چلے گئے تھے اور نواب سر سالار جنگ مرحوم نے ان کو نوکر رکھ لیا تھا۔ یہ نواب احمد سعید خاں صاحب رئیس خاندان لوہارو کے ماموں تھے اور کہا جاتا ہے کہ سرکاری مخبری کا الزام بھی ان پر تھا۔

لالہ رام جی داس صاحب - ان کے خاندان میں رائے بہادر لالہ سری کرشن داس صاحب اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔

مُوسیٰ خاں صاحب - ان کے بیٹے کا نام احمد حسین خاں تھا۔ نواب کلب علی خاں صاحب رئیس رام پور نے تیس روپے ماہوار ان کی گزر اوقات کے لئے مقرر کر دئے تھے۔

نواب نبی بخش خاں صاحب - دہلی دریبہ کلاں میں ان کی مسجد اب بھی موجود ہے۔ اور ان کی اولاد کے پاس معقول جائداد بھی ہے۔

محمّد علی خاں صاحب - ان کی حویلی اب بھی کوچہ چیلان میں موجود ہے اور آج کل اس حویلی میں چمار آباد ہیں۔

حکیم امام الدّین خاں صاحب - آج کل ان کا خاندان حکیم بقا والا کہلاتا ہے، اور چاوڑی کے قریب حکیم بقا والوں کی گلی مشہور ہے یہ لوگ آنکھوں کا علاج کرتے ہیں۔

میاں حسن عسکری صاحبؒ - چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ ان کے سگے بھانجے شاہ امیر حسین صاحب صابریؒ تھے۔ جن کی خانقاہ دریا گنج میں اب

بھی موجود ہے۔ جس کے موجودہ سجادہ نشین شاہ کرار حسین صاحب ہیں۔

بیرم خاں کے ترا ہے میں شاہ صاحب کی ایک بہت بڑی حویلی تھی جو آج کل رائے بہادر لالہ سلطان سنگھ صاحب آنجہانی کے بیٹے کے قبضہ میں ہے۔

نواب غلام فخر الدین خاں صاحب۔ انکے صاحبزادہ نواب احمد سعید خاں ہوئے اور ان کے فرزند نواب نصر اللہ خاں صاحب جو آجکل حیدر آباد دکن میں حضور نظام کے خزانہ کے صدر محاسب ہیں۔ نواب غلام فخر الدین خاں صاحب کا مزار درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رضؓ میں میرے مکان کے قریب ہے۔ اور بچپن میں میں اُن کے پاس ہمیشہ کھیلا کرتا تھا کیونکہ آخر عمر میں یہ ترکِ وطن کر کے اس مکان میں آگئے تھے جہاں انکا مزار ہے اور رات دن عبادت حق میں مصروف رہتے تھے۔ بڑی نورانی صورت تھی۔

نواب خواجہ مصلح الدین خاں صاحب۔ جن سے یہ تمام واقعات معلوم ہوئے ان کا تذکرہ بھی اس کتاب میں لکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام نواب خواجہ مصلح الدین خاں ہے۔ ان کے والد کا نام نواب خواجہ شرف الدین خاں صاحب تھا۔ اور ان کے والد نواب خواجہ زین العابدین خاں صاحب تھے۔ یہ خاندان ۲۹ واسطہ سے حضرت خواجہ یوسف ہمدانی رضؓ سے مل جاتا ہے۔ انکے والد کے دادا نواب خواجہ فرید الدین احمد خاں صاحب اکبر شاہ ثانی کے وزیر تھے۔ اور سر سیّد احمد خاں صاحب اس خاندان کے نواسہ تھے۔

بس ختم

"حسن نظامی"

دہلی

۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء

تاریخ غدر دہلی
کے
پہلے گیارہ حصے

پڑھنے ضرور ہیں۔ نہ پڑھے ہوں تو ان کے نام سن لیجیے اور ان کو فوراً خرید فرمائیے:۔

پہلا حصّہ	بیگمات کے آنسو	قیمت	عہ ۸/
دوسرا حصّہ	انگریزوں کی بپتا	"	۸/
تیسرا حصّہ	محاصرۂ دہلی کے خطوط	"	۴/
چوتھا حصّہ	بہادر شاہ کا مقدمہ	"	۶/
پانچواں حصّہ	گرفتار شدہ خطوط	"	عہ ۴/
چھٹا حصّہ	دہلی کے اخبار	"	۴/
ساتواں حصّہ	غالب کا روزنامچۂ غدر	"	۱۲/
آٹھواں حصّہ	دہلی کی جاں کنی	"	عہ/
نواں حصّہ	غدر کی صبح شام	"	عہ ۸/
دسواں حصّہ	دہلی کا آخری سانس	"	عہ ۸/
گیارھواں حصّہ	دہلی کی آخری شمع	"	عہ/

کارکن حلقۂ مشائخ بکڈپو۔ دہلی سے منگائیے